46.05. 19.8.56
50.93 27.9.56

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

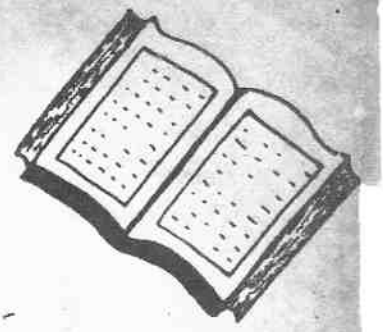

جمال وحسنِ قرآں نورِ جانِ ہر مسلماں ہے
قمر ہے چاند اوروں کا ہمارا چاند قرآں ہے

الفرقان

محرم الحرام ۱۳۷۶ھ

اگست ۱۹۵۶ء

سالانہ چندہ
پانچ روپے

ایڈیٹر
ابو العطاء جالندھری

مقام اشاعت
ربوہ - پاکستان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عشاقِ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست

رسالہ الفرقان کا "سیرۃ خیر البشر" نمبر

حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پاکیزہ زندگی اور حضورؐ کے روح پرور کلمات مومن کے قول و عمل کے لئے اُسوۂ حسنہ ہیں۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے وہ مقام بخشا ہے جو کسی اور نبی کو حاصل نہ ہو سکا۔ آپ سب سے افضل رسول ہیں اور انسانیت کا طغرائے امتیاز آپ کا وجودِ باجود ہے۔ آپ سے سچی محبت اور آپ کی کامل اتباع ہی ایمان کی علامت ہے۔ اسی طریق سے مسلمان خدا کا قرب پا سکتے ہیں۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو جاننا اور اس کے مطابق اپنے اعمال و اقوال کو بنانا ہمارا فرض ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے۔ کہ ہم حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگی کو پڑھیں اور اس کی اشاعت میں پورا حصہ لیں۔

رسالہ الفرقان اس روحانی مقصد کے لئے ماہ ستمبر اور اکتوبر کا رسالہ اکٹھا کر کے اکتوبر کے شروع میں "سیرۃ خیر البشر" نمبر شائع کر رہا ہے۔ اب ان تمام احباب سے درخواست ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق کی نعمت سے نوازا ہے اور پھر قوتِ تحریر بھی بخشی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ ۱۵ ستمبر تک ہمیں اپنے قیمتی مضمون سے نوازیں۔ رسالہ الفرقان اس نمبر میں حضورؐ کی زندگی کے اُن جملہ پہلوؤں کا ذکر کرنا چاہتا ہے جن سے آپ کا سید البشر ہونا ثابت ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ احباب اس درخواست پر خاص توجہ فرمائیں گے۔

خاکسار

ایڈیٹر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جلد ۵ عدد ۲	# الفرقان	محرم الحرام ۱۳۷۶ھ اگست ۱۹۵۶ء

فہرست مضامین

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
(۱) خلافت	ایڈیٹر	صؔ
(۲) شیعہ صاحبان کی تعزیہ داری	"	۹ؔ
(۳) اُمتِ مسلمہ کا امتیازی شرف اور موجودہ زمانہ میں اسکو ازسرنو بحالی	جناب مسعود احمد صاحب دہلوی بی۔اے	۱۷ؔ
(۴) مولانا مودودی کی انقلابی دعوت	جناب پروفیسر محمد سرور صاحب ایم۔اے	۲۵ؔ
(۵) البیانُ قرآن مجید کا سلیس اردو ترجمہ مختصر حواشی کے ساتھ۔	ابو العطاء	۲۹ؔ
(۶) سیرِ سوات	جناب مولوی خورشید احمد صاحب شاد۔ مولوی فاضل	۳۳ؔ

ادارۂ تحریر

ایڈیٹر:- ابو العطاء جالندھری

نائب ایڈیٹرز:-

میاں مسعود احمد دہلوی۔ بی۔اے

قاضی محمد نذیر لائلپوری مولوی فاضل

شیخ خورشید احمد شاد مولوی فاضل

ضروری اعلان

ماہ ستمبر و اکتوبر کا رسالہ سیرت خیر البشر نمبر (حجم یکصد صفحات) ماہِ اکتوبر کے شروع میں شائع ہو رہا ہے خریدار حضرات مطلع رہیں۔ اس نمبر کی علیحدہ قیمت ایک روپیہ ہے ——— (مینیجر)

(طابع وناشر ابو العطاء جالندھری نے ضیاء الاسلام پریس ربوہ میں چھپوا کر دفتر الفرقان احمد نگر ربوہ سے شائع کیا۔)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جلد ۵ | اگست ۱۹۵۶ء | الفرقان | محرم الحرام ۱۳۷۶ھ | شمارہ ۸

خلافت

جب سے دنیا کا آغاز ہوا ہے آدم و ابلیس کا واقعہ دہرایا جاتا ہے اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ انسانی قلوب اللہ تعالیٰ کی تجلیات کا مہبط بن جائیں اور ان سے آسمانی انوار کا انعکاس پیدا ہو۔ لیکن اللہ تعالیٰ اپنی اس مشیت کے نفاذ میں کسی جبر کو استعمال نہیں فرماتا۔ وہ اس مقصد کے لیے ایک انسان کو منتخب فرماتا ہے اور اسے خلافت کے خلعت سے سرفراز کرتا ہے۔ وہ اپنے زمانہ میں نورانی مشعل ہوتا ہے اور دلوں کو نورانیت بخشنا اسکا کام ہوتا ہے۔ اس سے تعلق پیدا کرنے والے اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کا مورد بنتے ہیں۔ اپنے قلوب میں جلا پاتے ہیں۔ اپنی زندگی کے مقصد کو پاکر دائمی سعادت کے وارث بنتے ہیں۔ اس **منتخب خلیفہ** سے علیحدہ رہنے والے اور اس کی مخالفت کرنے والے اپنے قلوب کو زنگ آلود کر لیتے ہیں۔ اور اپنے اوپر خدا کی ناراضگی اور اسکے غضب کو بھڑکاتے ہیں۔ یہ مخالفین چاہتے ہیں کہ ان آسمانی نوروں کو بجھا دیں جو خالق تک پہنچنے والی راہ کو منور کرتے ہیں اور خلق خدا کو دائمی ظلمت کا شکار بنا دیں۔

یہ کشمکش اور یہ رسہ کشی **اہل حق** اور **اہل باطل** میں ابتداء آفرینش سے جاری ہے۔ مختلف ناموں سے ان کا ظہور ہوتا رہتا ہے۔ ہر زمانہ کا نبی اور مامور **خلافت الٰہیہ** کا کامل نمائندہ ہوتا ہے۔ اس کی وفات کے بعد اللہ تعالیٰ اس کی تربیت یافتہ جماعت کے متقی ترین اور مقرب الی اللہ فرد کو اس نعمت سے سرفراز کرتا ہے اور ان نورانی شعاعوں کو دیر تک اس جماعت میں قائم رکھتا ہے جو نبی اور رسول کے ذریعہ سے جاری ہوتی تھیں۔ یہ **خلافۃ النبوۃ** ہوتی ہے۔ ان خلفاء کا سلسلہ ایک لمبے عرصہ تک الٰہی جماعتوں میں چلتا ہے۔ جس طرح انبیاء کے مامور کیے جانے پر بہت سے منکر لوگ ان کی مخالفت کو اپنا وطیرہ بنا لیتے ہیں اور ہر رنگ میں ان سے برسرپیکار ہو جاتے ہیں اور ان کی کامیابی کو روکنا چاہتے ہیں۔ اسی طرح نبی کی وفات کے بعد آسمانی سلسلہ کے استحکام اور اس کی روحانی تنظیم کی مضبوطی کے لئے جب اللہ تعالیٰ بذریعہ انتخاب کسی **خلیفہ** کو مقرر فرماتا ہے تو منافق لوگ اپنی ریشہ دوانیوں سے اس کی راہ کو روکنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس جماعت کے دلوں میں مختلف قسم کے وسوسے پیدا کرنے شروع کر دیتے ہیں۔

مگر کون ہے جو خدا کے ارادہ اور اس کے کام کو روک سکے؟ نبی آخر کار ایک **مقدس جماعت** بنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور **خلیفہ** اس جماعت کی شیرازہ بندی کو قائم رکھنے اور انہیں روحانی شاہراہ پر گامزن رکھنے میں کامران ہو جاتا ہے۔ انبیاء اور خلفاء کے دشمن اور حاسد آخر کار ناکام و نامراد رہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی یہ **سنت** اور اس کی یہ **فعلی شہادت** ابتدا سے جاری ہے اور آخر تک جاری رہے گی۔ اس سے

اللہ تعالیٰ کی ہستی کا ایک زبردست اور محسوس ثبوت ملتا ہے۔ نبی کی روحانیت مختلف انداز سے افرادِ جماعت میں سرایت کرتی ہے اور وہ مختلف پہلوؤں سے اس کے جانشین ہوتے ہیں۔ خلافت کا یہ وسیع مفہوم اپنی جگہ پر برحق ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ نبی کی وفات کے بعد اس کی **روحانیت** کا **مرکزی نقطہ** نبی کا **خلیفہ** ہوتا ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ **روح القدس** سے **مؤید** فرماتا ہے۔ اسے نبی کا سا **علم** اور حوصلہ عطا فرماتا ہے۔ اس کے کاموں میں **برکت** دیتا ہے اور اس کے انفاسِ قدسیہ بہتوں کو بیماریوں سے شفا بخشتا ہے۔ ان روحانی برکات کے علاوہ خلیفہ کا وجود جماعت کی یکجہتی اور **اتحاد کا شعار** ہوتا ہے۔ اسلئے اہلِ ایمان اس امر کے لئے کوشاں رہتے ہیں کہ خلافت کی نعمت کے دَور کو شکریہ کے ذریعہ سے زیادہ لمبا کریں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں نبوت کو خاص نعمت قرار دیا ہے اور پھر مومنوں سے خلافت کا **وعدہ** فرمایا ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا. يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (نور: ۵۶)

کہ تم میں سے اُن مومنوں سے جو نیکوکار ہیں وعدہ کرتا ہوں کہ انہیں زمین میں خلیفہ مقرر کروں گا جیسا کہ میں اس سے پہلی اُمتوں میں خلیفے بناتا رہا ہوں۔ اور پھر ان خلفاء کے دین کو جو میرا پسندیدہ دین ہے تمکنت اور عظمت بخشوں گا اور ان کے خوف کے بعد انہیں امن عطا کروں گا وہ میری عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں گے۔ جو شخص اتنے بڑے انعام کے بعد بھی انکار کریگا، اس نعمت (خلافت) کی ناقدری کرے گا وہ یقیناً فاسق اور بدعہد ہے۔

اس آیت پر تدبر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جماعتی استخلاف کے علاوہ انفرادی خلفاء کا بھی وعدہ کیا گیا ہے۔ پہلی امتوں میں عمومی جانشین کے علاوہ افراد خلیفہ ہوتے تھے۔ اور اگر غور کیا جائے تو درحقیقت جماعتی استخلاف کا ظہور اور اس کی برکات کا ثبوت بھی انفرادی خلفاء کے وجود باجود سے ہوتا ہے۔

اس وعدہ کا ایفاء یوں ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا اور سارے مسلمانوں کی زمام قیادت ان کے سپرد کردی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جس رنگ میں امتِ محمدیہ کے لئے آسمانی برکتوں کے دروازے کھولے وہ اسلامی تاریخ کا ایک روشن ورق ہے۔ بے شک **عہدِ صدیقی** میں مسلمان کہلانے والے کچھ لوگوں نے شر پیدا کیا اور سیدنا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ان کا مقابلہ کرنا پڑا۔ مگر بہرحال یہ دَور مسلمانوں اور ان کی تنظیم کے لئے نہایت بابرکت تھا۔

حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ اُمتِ مسلمہ کے خلیفہ مقرر ہوئے۔ آپ نے اپنے عہد میں وہ شاندار خدمات کیں اور اسلام کے نام کو چار دانگ عالم میں ایسے رنگ میں نمایاں کیا کہ اپنے تو اپنے بیگانے بھی ان بے مثال فتوحات پر حیران تھے۔ اس دَور میں بھی مسلمانوں کا ایک عنصر حضرت عمرؓ کی مخالفت کرتا رہا۔ مگر بہرحال خدا کی بات پوری ہوئی اور اسلامی نظام نہایت مستحکم بنیادوں پر قائم ہوگیا۔

حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد حضرت عثمانؓ کو اللہ تعالیٰ نے تیسرے خلافت پہنائی اور آپ نے مسلمانوں کی روحانی اور دنیوی ترقی کو چار چاند لگا دیئے۔ آپ نے اقصائے عالم میں اسلامی پرچم کو لہرایا۔ ان سارے زرّیں کارناموں کے باوجود

ایک گروہ مسلمان کہلانے والوں کا آپ سے برسرِ پیکار ہوا۔ اس نے فتنہ پیدا کیا اور بہت سے سادہ لوح مسلمانوں کو مغالطہ میں ڈالنے کی زبردست مہم شروع کر دی۔ اس شریر گروہ نے حضرت عثمان رضؓ سے مطالبہ کیا کہ وہ چادرِ خلافت کو اتار دیں اور اس منصب سے الگ ہو جائیں ورنہ انہیں شہید کر دیا جائے گا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ یہ قمیص تو مجھے اللہ تعالیٰ نے پہنائی ہے۔ میں اسے اتارنے والا کون ہوں۔ یا تم مجھے معزول کرنے والے کون ہو۔ سیدنا حضرت عثمانؓ شہید ہو گئے مگر خلافت کا مقام محفوظ و مصئون رہا۔

پھر ان کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ مقرر ہوئے آپ کی روحانی برکات اور فتوحات کا بھی ایک وسیع سلسلہ ہے۔ آپ نے مسلمانوں کی جماعت میں اتحاد و تنظیم کیلئے نہایت جانکاہ کوششیں کیں۔ آپ کے ذریعے مسلمان بہت سے عظیم الشان افضال الٰہیہ کے وارث ہوئے مگر فتنہ پرداز اس دور میں بھی مصروفِ فتنہ پردازی رہے اور انہوں نے ناموسِ خلافت کو پاؤں تلے روندنے کی ہر رنگ میں کوشش کی حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے اپنے خون کی قربانی پیش کر کے خلافت کی حفاظت کی مگر اسلامی آن پر حرف نہ آنے دیا۔ بے شک آپ نے جامِ شہادت پی لیا مگر خلافت کی مقدس امانت کو ہر طرح سے محفوظ رکھا۔

تاریخ سے ثابت ہے کہ خلفاءِ راشدین کے مبارک عہد میں روحانیت ہمیشہ غالب آتی رہی اور ایک قلیل عنصر کی شرارتوں کے باوجود جماعۃ المسلمین اسلام کی اشاعت، اس کی روحانی تنظیم، اس کے استحکام میں ہمہ تن مصروف تھے۔ وہ ایک فولادی دیوار کی طرح اپنے نصب العین کے پانے کے لئے مصروفِ عمل رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خدائی وعدوں کے مطابق اسلام کی عظمت کا سکہ بیٹھ گیا اور خدا کا دین ہر طرح سے غالب آ گیا۔

خلافتِ راشدہ کے مبارک زمانہ کے بعد بے شک افراد میں بڑے بڑے قابل روحانی انسان گزرے ہیں مگر وہ مجموعی برکات کا روحانی دور نظر نہیں آتا۔ یہ دراصل خلافت کی نعمت کی ناقدری کا نتیجہ تھا۔ اور یہ اتنی نمایاں بات ہے کہ اسے ہر مسلمان محسوس کرتا رہا ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم خوب جانتے تھے کہ خلافت مسلمانوں کے لئے بنیادی اینٹ یا ریڑھ کی ہڈی کی مانند ہے جس کے بغیر انسانی جسم بیکار ہو جاتا ہے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے پہلے خطبہ میں فرمایا تھا

"وقد استخلف اللہ علیکم خلیفۃ لیجمع بہ الفتکم ویقیم بہ کلمتکم"

کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے ایک خلیفہ مقرر فرمایا ہے۔ تا اس کے ذریعہ تمہارے اندر الفت پیدا کرے اور تمہارے اتحاد کو مضبوط اور محکم بنائے۔" (دائرۃ المعارف مطبوعہ مصر جلد ۳ صفحہ ۷۵۸)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک موقع پر حضرت ابوبکرؓ سے کہا تھا:-

"فواللہ لئن اصبنا بک لایکون للاسلام نظام"

کہ بخدا اگر آپ کو گزند پہنچا تو اسلام کا نظام باقی نہ رہے گا۔" (تاریخ کامل ابن اثیر جلد ۲ صفحہ ۱۷۷)

اسی موقع پر حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا:-

"فواللہ لئن فجعنا بک لایکون للاسلام نظام ابداً"

اللہ کی قسم! اگر آپ کو صدمہ پہنچ گیا تو پھر اسلام کی کبھی تنظیم قائم نہ ہو گی۔"

(تاریخ الخلفاء صفحہ ۵۲)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں جب

کچھ باغی لوگ حضرت عثمانؓ کی خلافت کے خلاف منصوبے کر رہے تھے تو ایک صحابی حنظلۃ الکاتب نے کہا ؎

عجبت لما یخوض الناس فیہ
یرومون الخلافۃ ان تزول
ولو زالت لزال الخیر عنھم
ولا قوا بعدھا ذلاً ذلیلا
وکانوا کالیھود او النصاریٰ
سواءً کلھم ضلوا السبیلا

ترجمہ:۔ مجھے ان لوگوں کی باتوں سے تعجب ہوتا ہے جو چاہتے ہیں کہ خلافت ختم ہو جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر خلافت جاتی رہی تو یہ لوگ ہر خیر و برکت سے محروم ہو جائینگے۔ اور اس کے بعد پوری طرح ذلیل ہو جائیں گے پھر وہ محرومی میں یہودیوں یا عیسائیوں کی طرح ہو جائیں گے۔ سب گمراہ ہونے میں برابر ہوں گے۔"

(تاریخ ابن اثیر جلد ۳ صـ۷۳)

ان حوالجات سے واضح ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم خلافت کے وجود کو اُمت کے لئے اللہ تعالیٰ کی عظیم الشان نعمت سمجھتے تھے اور خلافت کے خلاف ہر قسم کے منصوبوں کا وہ مقابلہ کرتے تھے۔ بعد کی صدیوں میں جب مسلمانوں میں سلطنت اور حکومت کا نظام رائج ہو گیا تب بھی اُمت خلافت کے نظام کے اجراء کے لئے متمنی رہی۔ گزشتہ سالوں میں مسلمان ممالک میں **تحریک خلافت** درحقیقت اسی دبی ہوئی خواہش کا ایک اظہار تھا۔

اللہ تعالیٰ نے اسلام کی نشأۃ ثانیہ کا آغاز حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی بعثت سے فرمایا۔ ایک جماعت قائم کی جس کا مقصد تخلیق اشاعت اسلام قرار پایا۔ اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ثانیہ (خلافت) کا سلسلہ اس جماعت میں دائمی طور پر جاری رہے گا۔ چنانچہ ۱۹۰۸ء میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی وفات کے بعد حضرت مولانا نور الدین رضی اللہ عنہ وارضاہ جماعت احمدیہ کے **خلیفۂ اوّل** منتخب ہوئے۔ آپ کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے جماعت کو استحکام بخشا۔ روحانی زندگی کی برکات سے نوازا۔ اس مبارک عہد میں بھی ایک گروہ احمدی کہلانے والوں کا آپ کی خلافت کے خلاف وسوسہ اندازی کرتا رہا مگر خدائی نوشتہ پورا ہوا۔ اللہ تعالیٰ کی تائید اور حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ کی قوت قدسیہ کے نتیجہ میں مخالفین ناکام رہے اور جماعت شاہراہ ترقی پر گامزن رہی۔

۱۹۱۴ء میں حضرت خلیفۃ المسیح الاوّلؓ کی وفات پر اس گروہ نے فتنہ کی یہ صورت پیدا کی کہ جماعت کی شیرازہ بندی کو بکھیرنے کے لئے کہا کہ جماعت میں خلافت کی ضرورت ہی نہیں۔ مگر احمدی چھ سال تک خلافت اولیٰ کی برکات اپنی آنکھوں مشاہدہ کر چکے تھے۔ اور ہزاروں مرتبہ حضرت خلیفہ اوّلؓ سے آئندہ سلسلۂ خلافت کے جاری رہنے کی بشارت سُن چکے تھے[1] اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے واضح ارشادات ان کی نظروں میں تھے جن میں حضور نے جماعت احمدیہ میں سلسلۂ خلافت کے قیام کی بشارت دی تھی۔ احمدیوں نے ان فتنہ پردازوں کی منصوبہ بندی کو ناکام بنا دیا اور اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کے وعدوں کے مطابق جماعت احمدیہ کے انتخاب سے سیدنا حضرت میرزا بشیر الدین محمود احمد ایدہ اللہ بنصرہ جماعت احمدیہ کے **خلیفۂ دوم** مقرر ہو گئے۔ اہل باطل کو اپنی ناکامی کا

---

[1] حضرت خلیفۂ اوّلؓ نے مرض الموت میں بھی فرمایا تھا:۔
"خلیفہ اللہ ہی بناتا ہے میرے بعد بھی اللہ ہی بنائیگا۔" (اخبار پیغام صلح لاہور ۲۴ فروری ۱۹۱۴ء)

سخت صدمہ تھا۔ انہوں نے لاہور میں ڈیڑھ اینٹ کی علیحدہ مسجد بنیاد کرنی شروع کر دی۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے آج **خلافتِ ثانیہ** کی بابرکت اور روحانی فتوحات سے لبریز عہد پر بیالیس برس گزر چکے ہیں۔ اس سارے عرصہ میں **اہل پیغام** نے اندرونی طور پر بہت سے فتنے پیدا کرنے چاہے اور مخالفین سلسلہ سے بارہا ساز باز کر کے جماعت احمدیہ کی تنظیم، اس کے اتحاد اور اس کی قوتِ عملیہ کو شل کرنا چاہا مگر ہر بار انہیں ناکامی ہوئی اور ہر مرتبہ یہ فتنہ جماعت کی ترقی کے لئے کھاد کا کام کر گیا۔ یہ ناکام فتنہ پرداز لوگ حسد و حسرت کے انگاروں پر لوٹ رہے ہیں۔ اب یہ خیال کر کے کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ بنصرہ پر شدید بیماری کا حملہ ہوا ہے انہوں نے نئے سرے سے سر اٹھایا ہے اور اب مختلف لبادے اوڑھ کر جماعت کی وحدت کو انتشار سے بدلنے کے لئے کوشاں نظر آتے ہیں۔ خدائی وعدوں کے مطابق ان لوگوں کا اس کوشش میں ناکام و نامراد ہونا ایک یقینی امر ہے مگر تاہم جماعت احمدیہ کے لئے نہایت حزم و احتیاط کا مقام ہے۔ صدہا سالوں کے بعد اللہ تعالیٰ نے اُمتِ مسلمہ کو پھر نعمتِ خلافت سے سرفراز کیا ہے۔ اب اگر اختلاف اور ناشکری کے نتیجہ میں خدانخواستہ یہ نعمت چھن جائے تو کتنی بڑی ناکامی اور نامرادی ہے۔

اے احمدی جماعت! خلافت اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص فضل اور نہایت ہی عظیم الشان نعمت ہے پہلے لوگوں کے حالات پر نظر دوڑا کر اس نعمت کی قدر کر۔ اسی نعمت کی قدر کر اس نعمت کی قدر کر۔ تا اللہ تعالیٰ بہت ہی لمبے عرصہ تک اس نعمت سے جماعت کو سرفراز کرتا رہے۔ اللّٰھمّ آمین یا ربّ العٰلمین +

بھائیو! حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اپنی آخری تحریر میں ہندو قوم کے سامنے جو معاہدہ کی تجویز پیش فرمائی تھی اس میں حضور تحریر فرماتے ہیں:۔

"اگر ہندو صاحبان دل سے ہمارے ساتھ صفائی کرنا چاہتے ہیں تو وہ بھی ایسا ہی اقرار لکھ کر اس پر دستخط کر دیں اور اس کا مضمون بھی یہ ہوگا کہ ہم حضرت محمد مصطفےٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور نبوت پر ایمان لاتے ہیں اور آپ کو سچا نبی اور رسول سمجھتے ہیں اور آئندہ آپ کو ادب اور تعظیم کے ساتھ یاد کریں گے۔ جیسا کہ ایک ماننے والے کے مناسب حال ہے۔ اور اگر ہم ایسا نہ کریں تو ایک بڑی رقم تاوان کی جو تین لاکھ روپیہ سے کم نہیں ہوگی **احمدی سلسلہ کے پیشرو** کی خدمت میں پیش کریں گے۔ یاد رہے کہ ہماری **احمدی جماعت** اب چار لاکھ سے کچھ کم نہیں ہے اسلئے ایسے بڑے کام کے لئے تین لاکھ روپیہ چندہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ اور جو لوگ ہماری جماعت سے ابھی باہر ہیں دراصل وہ سب پراگندہ طبع اور پراگندہ خیال ہیں۔ کسی ایسے **لیڈر** کے ماتحت وہ لوگ نہیں ہیں جو اُن کے نزدیک **واجب الاطاعت** ہے۔"

(رسالہ پیغام صلح صفحہ ۲)

احمدی جماعت ایک واجب الاطاعت لیڈر اور امام کے ماتحت ہے۔ خلیفۂ وقت ان کا امام مطاع ہے ہے۔ یہی چیز اس دَور میں جماعت احمدیہ کو دوسرے تمام

مسلمان کہلانے والے فرقوں سے ممتاز کرتی ہے۔ پس خلافت کی نعمت کی قدر کرنا ہمارا اولین فرض ہے۔

مولوی محمد علی صاحب مرحوم نے ۱۹۱۴ء میں جماعت سے الگ ہو کر خلافت کا انکار کیا تھا۔ مگر سالہا سال کے تجربہ کے بعد آخر انہیں بھی کہنا پڑا کہ:-

"نظام کی **بنیاد** ایک ہی بات پر ہے۔ کہ اسمعوا و اطیعوا سنو اور اطاعت کرو۔ جب تک یہ رُوح نہ پیدا ہو جائے۔ جب تک تمام افراد جماعت ایک آواز پر حرکت میں نہ آجائیں۔ جب تک تمام اطاعت کی ایک سطح پر نہ آجائیں ترقی محال ہے۔ غور کر کے دیکھ لیجئے اس کے بغیر کوئی نظام قائم رہ سکتا ہی نہیں۔ یہی **اصول** تھا جس نے حضرت **ابوبکرؓ عمرؓ** اور **عثمانؓ** کے **زمانہ** میں مسلمانوں پر فتوحات کے دروازوں کو کھول دیا تھا۔"

(پیغام صلح ۲۷ر فروری ۱۹۳۶ء ملا)

جب مسلمانوں کی ترقی خلافت سے ہی وابستہ ہے اور خلافت ہی مسلمانوں کی لامرکزیت کا واحد علاج ہے۔ تو کیا اب بھی کوئی باشعور احمدی بلکہ کوئی سمجھدار غیر مبائع بھی خلافت کی برکات کا انکار کر سکتا ہے؟

اُمتِ مسلمہ کا امتیازی شرف

(بقیہ صفحہ ۲۴)

میں آتی ہیں صدیوں میں اپنے عروج کو پہنچتی ہیں ظاہر ہے کہ ایک ایسی دوڑ میں کہ جو بہت طویل ہو بسا اوقات میدان سیاہ گھوڑے ہی کے ہاتھ رہتا ہے۔ حالانکہ اسکے جیتنے کی بظاہر کوئی امید نہیں ہوتی۔" ("Civilization on Trial" By Arnold J. Toynbee Page 204)

اس امر کو مزید واضح کرنے کے لئے کہ وہ مذہبی تحریکیں کہ جو دو عظیم تہذیبوں کے تصادم کے وقت جنم لیتی ہیں آہستہ آہستہ ترقی کر کے بالآخر دنیا پر چھا جاتی ہیں مسٹر ٹوئن بی نے مسیحیت کی ابتدائی کس مپرسی کو پیش کیا ہے اور لکھا ہے کہ کیا اُس زمانے کی رومی سلطنت اور فلسطین کے یہودی کہ جب مسیح علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے یہ بات تصور میں بھی لا سکتے تھے کہ ناصرہ کی بستی سے اُٹھنے والی تحریک دُنیا میں بالآخر رنگ لائے گی۔ اگر آئندہ چل کر رونما ہونے والے واقعات کسی صورت اُن کو قبل از وقت دکھا دیئے جاتے تو یقیناً اُن کی حیرت اور اُنکے صدمہ کی کوئی انتہا نہ رہتی۔

اس سے ظاہر ہے کہ مغرب کا وہ اہل علم طبقہ جسے فہم و فراست کی بنا پر کچھ نہ کچھ بصیرت حاصل ہے دیکھ رہا ہے کہ مغرب میں اسلام کی جس تبلیغ کا آج آغاز ہوا ہے۔ وہ بالآخر ایک وقت میں ساری دُنیا کو متاثر کئے بغیر نہ رہے گی۔ اور عین ممکن ہے کہ اس کے نتیجے میں اسلام ایک دفعہ پھر دُنیا میں غالب آکر موجودہ عالمی نظام کو یکسر بدل ڈالے۔ چنانچہ مسٹر ٹوئن بی اس حقیقت کی طرف کسی قدر واضح الفاظ میں اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"اگر یہ مثالیں کچھ بھی اہمیت رکھتی ہیں اور کیوں نہ رکھیں جبکہ تاریکی میں لپٹے ہوئے مستقبل کے بارے میں یہی وہ روشنی کی کرن ہیں کہ جن سے ہمیں کچھ رہنمائی مل سکتی ہے تو یہ اس امر کی آئینہ دار ہیں کہ **اسلام مغربی تہذیب کے اس آخری دور میں چھوٹے طبقوں کے اندر پھیلنے کے بعد دُنیا کے مستقبل پر ایسے ایسے رنگ میں اثر انداز ہوگا کہ آج ہم جس کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔"** (ص ۲۰۳)

یہ اسی مغرب میں اسلام کے غالب آنے کے متعلق مسٹر ٹوئین بی کی پیشن خبری ہے کہ جس کے متعلق مسٹر ہنری بیروز نے آج سے ساٹھ سال قبل بڑے ادعا سے کہا تھا کہ اسلام مغرب کی فضا میں سانس لے ہی نہیں سکتا۔ آج واقعاتی شہادت کی رُو سے اسی سرزمین میں اسلام پھیل رہا ہے۔ اور اہل مغرب کی سعید روحیں اس کے محاسن کی گرویدہ ہو ہو کر اس کی طرف پروانہ وار کھنچی چلی آرہی ہیں۔ یقیناً یہ عظیم الشان کارنامہ اس فریضہ کی کماحقہٗ ادائیگی کے نتیجے میں ظاہر ہوا ہے کہ جس پر "خیرِ اُمّت" کہلانے کا شرف منحصر تھا اور بلاشبہ اس امتیازی شرف کی بحالی حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی قوتِ قدسی اور حضرت المصلح الموعود ایّدہ اللہ الودود کی موعودہ اولوالعزمی کے ذریعہ ہی عمل میں آئی ہے۔ اور اس شان سے عمل میں آئی ہے۔ کہ صدیوں کی مایوسیاں اور بے عملیاں کافور ہو کر رہ گئی ہیں۔ آج اسی اُمّت کے منتخب افراد کے ہاتھوں بیک وقت ساری دنیا میں **امر بالمعروف اور نہی عن المنکر** کا فریضہ منتظم طریق پر ادا ہو رہا ہے۔ جو مولانا ابوالکلام آزاد کے الفاظ کے بموجب اس فریضہ کی ادائیگی سے یکسر غافل ہو چکی تھی۔ آسمانی پیشگوئیوں کے عین مطابق اس عظیم الشان انقلاب کا ظہور حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایّدہ اللہ کے "پسر موعود" ہونے پر زندہ گواہ ہے اور اس حقیقت کو روزِ روشن کی طرح عیاں کر رہا ہے۔ کہ آج دُنیا کی اقوام اسی "پسر موعود" سے برکت پا رہی ہیں۔ اور "پسرِ موعود" کی شہرت دنیا کے کناروں تک پہنچ چکی ہے۔

مبارک ہیں وہ جو سیدنا حضرت المصلح الموعود ایّدہ اللہ الودود کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اپنے آپ کو **ولتکن منکم اُمّۃ یدعون الی الخیر و یأمرون بالمعروف وینھون عن المنکر** کا مصداق قرار دیئے جانے کا اہل ثابت کرتے ہیں۔ کیونکہ اصل کامیابی انہی کے لئے مقدر ہے ❖

کامیابی

اللہ تعالیٰ کے فضل سے میرے بھائی عطاء الرحمن صاحب طاہر مولوی فاضل نے اس سال پرائیویٹ تیاری کے ساتھ ادیب (ملٹنگمری ڈویژن) کا امتحان نہایت امتیاز سے پاس کیا ہے جیلہ سٹرسے بفضل اللہ کامیاب ہونیوالوں میں آپ فرسٹ ڈویژن میں اوّل نمبر پر آئے ہیں۔ الحمد للہ۔ احباب دُعا فرماویں کہ اللہ تعالیٰ بھائی جان کو مزید دینی و دنیوی ترقیات بخشے۔ آمین۔

عطاء الرحیم حامد متعلم ایف۔ ایس۔ سی کلاس
تعلیم الاسلام کالج ربوہ۔

شیعہ کتب کی رُو سے ایک تحقیقی مقالہ

شیعہ صاحبان کی "تعزیہ داری"

قرآنی ارشادات اور ائمہ اطہار کے بیانات کے صریح خلاف ہے

اسلام دینِ فطرت ہے۔ اس نے انسانی زندگی کے تمام مواقع کے لئے کامل شریعت پیش کی ہے۔ انسان کی اخلاقی اور روحانی زندگی کے لئے مکمل دستورِ حیات مقرر فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ جو کائنات کا خالق ہے اس نے قرآن مجید میں زندگی اور موت کی حالتوں کے لئے جامع احکام نازل فرمائے ہیں۔ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ جو پیدا ہوا ہے وہ ضرور مرے گا۔ اور موت کا حادثہ عام قانون کے ماتحت واقع ہو یا غیر معمولی رنگ میں ظاہر ہو۔ بہرحال آدمزاد کے لئے تکلیف اور رنج کا موجب ہے۔ ہاں اس دُکھ درد کی نوعیت فوت ہونے والے وجود کی افادی حیثیت، اس کے رابطہ و تعلق اور وفات کی ہیئت کذائی کے اختلاف سے ضرور کم و بیش ہوتی ہے۔ زیادہ مفید وجود، زیادہ قریبی اور پیارے وجود کی جُدائی زیادہ شاق گذرتی ہے۔ اور اگر یہ وفات مظلومیت کی وفات ہو تو اس سے جذباتِ رنج زیادہ اُبھرتے ہیں اور دُکھ درد کا احساس بہت گہرا ہوتا ہے۔

قرآن مجید نے موت کو **اٹل حادثہ** قرار دیا ہے کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ۔ قرآن مجید نے راہِ خدا میں مرنے والوں کو **شہید** ٹھہرایا ہے اور ان کی **زندگی** کا اعلان کیا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالےٰ مومنوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ۭ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ اُولٰۗىِٕكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۣ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ۝

(بقرہ ۵: ۱۵۲ — ۱۵۷)

ترجمہ:۔ اے مومنو! صبر اور **نماز** کے ذریعہ سے خدا کی مدد طلب کرو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ جو راہِ خدا میں قتل کئے جائیں انہیں مُردہ مت کہو بلکہ وہ **زندہ** ہیں لیکن تم اس کا شعور نہیں رکھتے۔ ہم تمہیں خوف، بھوک، مالی نقصان، جانوں کے اتلاف اور پھلوں کی بربادی سے آزماتے رہیں گے۔ اے نبی! ان نقصانات پر اُن صبر کرنیوالوں کو بشارت دیدے کہ جونہی ان پر مصیبت نازل ہوتی

ہے وہ جھٹ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن کہتے ہیں۔ یعنی ہم خدا کے ہیں اور اسی کی طرف واپس جانے والے ہیں۔ ان لوگوں پر ان کے رب کی طرف سے برکات اور رحمتیں نازل ہوں گی اور یہ ہدایت پانے والے ہیں۔"

کتنی جامع تعلیم ہے اور کتنے واضح احکام ہیں۔ صاف فرما دیا کہ ہر قسم کی آفات اور مصائب وارد ہوں گی۔ تم میں سے کچھ لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہید بھی ہوں گے ان تمام مشکلات اور صدمات کے اوقات میں تم نے دامن صبر کو نہ چھوڑ دینا بلکہ ہر مصیبت کے وقت صبر اور حوصلہ سے کام لینا اور اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ایسی **کلید صبر** پر غور کر کے اپنے دل کو ڈھارس دینا۔ تم اپنے شہیدوں کو زندہ سمجھو۔ ان پر جزع فزع اور واویلے کے طریق کو اختیار مت کرو۔ ہاں اللہ تعالیٰ کی عون و نصرت کے جذب کرنے کے لئے اس کے **صابر** بندے بن جاؤ۔ صابروں کے لئے بشارات ہیں اور ان کے لئے رحمت و برکات ہیں، ان کیلئے ہدایت ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْن۔ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

قرآن مجید کی اس شاندار اور اعلیٰ تعلیم کے بعد تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمان قوم اپنے کسی فرد کی موت پر خواہ وہ کتنا عظیم المرتبت فرد ہو، خواہ وہ کتنا مفید اور پیارا وجود ہو نسلاً بعد نسلٍ اور قرناً بعد قرنٍ **نوحہ** اور **ماتم** کرتی چلی جائے گی اور اپنی نئی پود کو صبر و حوصلہ کا درس دینے کی بجائے جزع فزع کا عادی بنا دیگی۔ خداوند تعالیٰ نے جب طور پر تو نہیں فرمایا کہ راہِ خدا میں مرنے والے مُردہ نہیں، انہیں مُردہ مت کہو بلکہ وہ زندہ ہیں۔ کیا یہ تعلیم مسلمانوں کے دلوں میں جوشِ جہاد اور ان کی رگوں میں خونِ حریت دوڑانے کے لئے کافی نہیں؟۔ یقیناً یہ تعلیم مسلمانوں کی ترقی، ان کی راہِ خدا میں فدائیت، اور اُن کے بلند عزائم کے لئے اساس کی حیثیت رکھتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کو **توحید** سب سے پیاری ہے۔ وہ شرک کو ہر نوع ناپسند کرتا ہے۔ اس نے سب کے لئے موت مقدر فرما کر اپنے **الحیّ القیّوم** ہونے کا ثبوت دیدیا۔ انسانوں کی یہ موت درسِ توحید کا ایک رنگ ہے۔ جس سے مومنانہ شجاعت اور جرأت پیدا ہوتی ہے۔

اسلام دینِ فطرت ہے۔ موت کے حادثہ پر غم پیدا ہونا اور آنسو بہہ جانا ایک فطرتی بات ہے اسلئے اسلام نے ایک حد تک فطرت کے مطابق اظہارِ غم کی اجازت بخشی ہے۔ لیکن اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا کہ مسلمان کسی انسان کی وفات پر جزع فزع کو اپنا شعار بنالیں اور نوحہ اور ماتم کی مجلسیں قائم کریں اور "تعزیت" کے نام پر شیعہ بھائیوں کی طرح کاغذوں کے تعزیے بنانے شروع کر دیں ہم نے جہاں تک **قرآن و سُنّت** کا مطالعہ کیا ہے اور جہاں تک ائمہ اہلبیت کے **ارشادات** پر نظر دوڑائی ہے ہمارے نزدیک شیعہ صاحبان کا موجودہ طریق تعزیہ درست اور اسلامی روح کے مطابق نہیں ہے۔

اہلسنّت والجماعت اور اہل تشیّع میں

حضرت **امام حسین** رضی اللہ عنہ کی ذات مابہ النزاع نہیں ہے۔ سارے ہی کلمہ گو حضرت امام حسینؓ کو بزرگ اور مقدس امام یقین کرتے ہیں۔ سبھی ان کی روحانی منقبت کے قائل ہیں۔ اور سب مسلمان ان کی **مظلومانہ شہادت** کے معتقد ہیں اور اس روح فرسا واقعہ سے دردمند اور افسردہ ہیں۔ یہ باتیں اختلافی نہیں ہیں۔ دونوں فرقوں میں **اختلاف** صرف یہ ہے کہ آیا حضرت امام حسینؓ کی شہادت کے نام پر ہر سال نوحہ اور ماتم کے جلوس قائم کرنا اور کاغذوں کے تعزیئے بنا کر انہیں گلی کوچوں میں لے پھرنا یہ روا ہے یا نہیں؟ شیعہ صاحبان اپنی اس "تعزیہ داری" کو **رکنِ ایمان** قرار دیتے ہیں اور سُنّی حضرات کے نزدیک یہ

ناجائز ہے فیصلہ کیونکر ہو؟

ہم قرآن مجید کی چند آیات پیش کر کے مصائب کے موقع پر اسلامی احکام واضح کر چکے ہیں۔ قرآن پاک میں اور بھی متعدد مقامات پر صبر کی تلقین موجود ہے۔ اسکی مثالیں دی گئی ہیں اور صبر کا بہترین اجر بیان کیا گیا ہے۔ قرآن مجید تو شیعوں اور سنیوں کا ایک ہی ہے۔ مگر احادیث نبویہ اور روایات ہر فریق کی علیحدہ ہیں۔ ہم چونکہ شیعہ بھائیوں سے خطاب کر رہے ہیں۔ اور ان کے نزدیک صرف وہی روایات حجت ہیں جو اُن کی مسلم کتب احادیث میں ہوں یا ان کے ائمہ سے مروی ہوں۔ اسلئے ہم ذیل میں مسئلہ تعزیہ پر صرف شیعی مستند روایات درج کرتے ہیں ہمیں توقع ہے کہ ہمارے اس مضمون کو شیعہ صاحبان پوری توجہ و خلوص سے مطالعہ فرمائیں گے۔ ہماری تحقیق کا قطعی نتیجہ یہ ہے کہ عوام شیعہ اپنے ائمہ کے ارشادات سے ناواقفیت کی وجہ سے تعزیہ پرستی میں مبتلا ہیں۔ ورنہ ذیل کے بیانات کے بعد یہ طریق اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ بہرحال ہم مخلصانہ انداز میں یہ معروضات پیش کر رہے ہیں

اسلامی تعزیت کی تعریف

شیعی لغت میں لکھا ہے :۔

"اراد بالتعزی العزاء الی التصبر والتسلی عند المصیبۃ وشعارہ ان یقول انا للہ وانا الیہ راجعون کما امر اللہ"

کہ صحیح تعزیت مصیبت کے وقت صبر اور تسلی رکھنے کا نام ہے اور اس کی درست صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق مصیبت کے وقت انا للہ وانا الیہ راجعون کہے" (مجمع البحرین)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :۔

"من لم یتعز بعزاء اللہ تقطعت نفسہ علی الدنیا حسرات"

(تفسیر القمی ص۳۵۶)

کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے طریق کے مطابق صبر اور حوصلہ نہیں کرتا اس کا نفس دنیا کی خاطر حسرتوں سے چور چور ہو جاتا ہے"

پھر لکھا ہے :۔

"وفی الحدیث من استرجع عند المصیبۃ جبر اللہ مصیبتہ"

کہ حدیث نبوی میں آیا ہے کہ جو شخص مصیبت کے وقت انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ اسکی مصیبت کو ہلکا کر دیتا ہے"

(مجمع البیان جلد ۱ ص۱۲۱)

ان حوالجات سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد اور لغت کے رُو سے تعزیت یہ ہے کہ انسان مصیبت کے وقت انا للہ وانا الیہ راجعون کہہ کر صبر کرے اور کسی قسم کا جزع فزع یا واویلا نہ کرے۔

صبر کرنے کی فضیلت

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں :۔

"واذا فارق الصبر الامور فسدت الامور"

کہ جب صبر جاتا رہے تو سارے کام خراب اور تباہ ہو جاتے ہیں" (الصافی شرح اصول الکافی جلد ۴ ص۱۷۶)

آیت قرآنی اصبروا وصابروا (آل عمران: ۲۰۰) پر حضرت امام ابو جعفر فرماتے ہیں :۔

"معناہ اصبروا علی المصائب"

کہ اس کے معنے یہ ہیں کہ مصیبتوں پر صبر کیا کرو"
(مجمع البیان زیر آیت مذکورہ)

حضرت امام صادقؒ فرماتے ہیں:-

"انا اھل البیت نجزع قبل المصیبۃ فاذا نزل امر اللہ عزوجل رضینا بقضائہ وسلمناہ لامرہ ولیس لنا ان نکرہ ما احب اللہ لنا"

ترجمہ:- ہم اہل بیت مصیبت کے وارد ہونے سے پہلے گھبراتے ہیں۔ مگر جب خدا کی تقدیر وارد ہو جائے تو ہم خدا کے فیصلہ پر راضی ہو جاتے ہیں اور اس کے حکم کو تسلیم کر لیتے ہیں۔ ہمارا کیا حق ہے کہ ہم اس چیز کو ناپسند کریں جسے اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے پسند فرمایا ہے"

یہ وہ صبر کی تعلیم ہے جو ائمہ اطہار نے پیش فرمائی ہے۔ اور اپنے اتباع کو اس کی تلقین کی ہے۔

نوحہ کرنا جاہلیت کا طریق ہے

رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:-

"النیاحۃ من عمل الجاہلیۃ"

کہ نوحہ کرنا جاہلیت کا کام ہے۔ یہ اسلامی طریق نہیں" (تفسیر القمی ص۲۶۷)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے کہ "چہار خصلت بد ہمیشہ در امت من خواہد بود" کہ چار بری خصلتیں میری امت میں ہمیشہ رہیں گی۔ ان میں سے ایک "نوحہ کردن" نوحہ کرنا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا:-

"اگر نوحہ کنندہ توبہ نہ کند پیش از مردن چوں روز قیامت مبعوث شود جامہ از مس گداختہ و جامہ از جرب بر او پوشانند"

ترجمہ:- اگر نوحہ کرنے والا مرنے سے پہلے توبہ نہ کرلے تو وہ جب قیامت کے دن مبعوث ہوگا تو اسے پگھلے ہوئے تانبہ کا کرتہ پہنایا جائے گا اور اس پر خارش کا کرتہ پہنائیں گے"
(حیات القلوب جلد ۲)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں سے بیعت لیتے وقت عہد لیا:-

"لا تلطمن خداً ولا تخمشن وجھاً ولا تنتفن شعراً ولا تشققن جیباً ولا تسودن ثوباً ولا تدعین بویل"

ترجمہ:- کہ تم نے مصیبت کے وقت رخساروں کو نہ پیٹنا۔ نہ منہ نوچنا۔ نہ بال نوچنا۔ نہ گریبان پھاڑنا۔ نہ سیاہ کپڑے پہننا اور نہ نوحہ کرتے پھرنا اور واویلا مچانا"
(تفسیر الصافی سورۃ الممتحنۃ ص۵۱۳)

اب شیعہ حضرات غور کریں کہ محرم میں ان کے ہاں کیا ہوتا ہے؟ کیا ان کے ہاں صریح طور پر ان شرائط بیعت کی برملا نافرمانی نہیں ہوتی؟ حضور علیہ السلام کا اقرار بیعت کے وقت یہ امور بطور شرائط ذکر کرنا انکی اہمیت کو واضح کرتا ہے۔ نیز اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ امت کا ایک حصہ ان کی خلاف ورزی کرنے والا تھا۔ شیعہ صاحبان ہی بتائیں کہ ان شرائط کو کھلے بندوں توڑ کر وہ کس طرح اسلام کا دعویٰ کر سکتے ہیں؟

نوحہ کرنے سے عمل حبط ہو جاتے ہیں

حضرت امام ابو جعفر جزع کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"اشد الجزع الصراخ بالويل والعويل ولطم الوجه والصدر وجز الشعر من النواصي ومن اقام النواحة فقد ترك الصبر واخذ فى غير طريقه ومن صبر واسترجع وحمد الله عزّ وجلّ فقد رضى بما صنع الله ووقع اجره على الله ومن لم يفعل ذلك جرى عليه القضاء وهو ذميم واحبط الله تعالىٰ اجره۔"

ترجمہ:- "واویلا مچانا اور نوحہ کرنا اور منہ پیٹنا اور سینہ کوبی کرنا اور سر کے بال نوچنا صریح جزع فزع ہے جس نے نوحہ کیا اس نے صبر کو چھوڑ دیا اور غیر اسلامی طریق اختیار کر لیا۔ ہاں جو صبر کرتا ہے اور اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن کہتا اور خدا کی تعریف کرتا ہے وہ خدا کی مشیت پر راضی قرار پاتا ہے۔ اللہ کے ہاں اس کا اجر مقرر ہو چکا ہے۔ لیکن جو ایسا نہ کرے گا اس پر خدا کی تقدیر جاری ہوئی اور وہ مذموم ہوگا اور اللہ تعالےٰ اس کے اجر کو حبط کر دیگا۔" (فروع الکافی کتاب الجنائز ط۱۲۱)

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ فرماتے ہیں:-

"ینزل الصبر علیٰ قدر المصیبۃ ومن ضرب یدہ علیٰ فخذہ عند مصیبۃ حبط عملہ۔" کہ صبر کا اجر مصیبت کی مقدار کے مطابق ہوتا ہے۔ جو شخص مصیبت آنے پر رانوں پر ہاتھ مارتا ہے اس کے عمل حبط ہو جاتے ہیں۔"

(نہج البلاغہ مشہدی ورق ۱۲۸)

پس ائمہ اطہار کی تعلیم کے مطابق نوحہ کرنے اور پیٹنے سے انسان کے عمل حبط ہو جاتے ہیں اور اس کی نیکیاں ضائع ہو جاتی ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ جن اماموں کی محبت کا دعویٰ شیعہ صاحبان کو ہے کیا ان کے احکام کو پس پشت ڈالکر وہ نوحہ کرنے اور پیٹنے میں مشغول رہیں گے یا انکی ہدایت پر عمل کر کے تعزیہ پرستی سے باز آجائیں گے؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے موقع کے لئے احکام

اہل سنت اور اہل تشیع کو مسلّم ہے کہ زیادہ مصائب و ابتلاء انبیاء علیہم السلام پر آئے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اشدّ الناس بلاءً الانبیاءؑ۔ کہ سب سے زیادہ ابتلاء انبیاء پر آئے ہیں۔ (اصول کافی مشہدی ص۳۲۲) چونکہ جملہ انبیاءؑ کے سرتاج ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اسلئے آپ پر نبیوں میں سب سے زیادہ ابتلا آئے اور آپ نے کامل صبر کیا۔

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا روحانی مقام سب سے بلند تھا اور آپ کے متبعین کو آپ سے بے مثال عقیدت اور بے پایاں محبت تھی اسلئے آپ کا حادثۂ وفات اُمّت کے لئے سب واقعات سے زیادہ جانگداز اور روح فرسا تھا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے حضورؐ کی وفات پر فرمایا تھا:-

"وان الجزع لقبیح الا علیک وان المصاب بک لجلیل وانہ قبلک وبعدک لجلل۔

کہ اے سید الانبیاء! تیرے سوا کسی اور پر جزع فزع کرنا سخت قبیح ہے اور تیرا حادثہ سب حادثوں سے بڑا ہے۔ اسکے مقابلہ پر تمام پہلے پچھلے حوادث بے حقیقت اور حقیر ہیں۔"

(نہج البلاغۃ ورق ۱۲۵)

پھر اسی سلسلہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"اگر نہ بود کہ امر کردی بصبر کردن ونہی نمودی از جزع نمودن ہر آئینہ آبہائے سر خود را در مصیبت تو فرو مے ریختیم وہر آئینہ در مصیبت تو ہرگز دوائے نکردیم وجراحت مفارقت ترا از سینہ بیروں نمے کردیم وایں ہا در مصیبت تو اندکے است از بسیار"

ترجمہ:۔ اگر یہ بات نہ ہوتی کہ آپ نے خود صبر کرنیکا حکم دیا ہے اور جزع فزع کے اظہار سے منع فرمایا ہے تو ہم آپ کی مصیبت (یعنی حادثہ وفات) میں یقیناً آنکھوں کے سارے آنسو بہا دیتے اور کبھی اس درد کے چارہ کے متلاشی نہ ہوتے۔ آپ کی جدائی کے زخم کو سینہ سے کبھی باہر نہ کرتے اور پھر بھی یہ سب اس مصیبت کے مقابلہ میں نہایت حقیر اور قلیل ہوتا۔" (حیات القلوب جلد ۲ صفحہ ۷۲۲)

پس حضرت امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سب جہانوں کے حادثوں سے بڑا حادثہ ہے اور اگر جزع کرنا روا ہوتا تو آپ کی وفات پر جزع فزع کیا جاتا۔ مگر جب آپ کی وفات پر بھی اُمت کو صبر کرنیکا حکم ہے اور ہر قسم کے جزع فزع اور نوحہ کرنے سے منع کیا گیا ہے تو اور کون ہے جس کیلئے یہ افعال روا اور جائز ہونگے؟

رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی صریح وصیّت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا سے بطور وصیّت فرمایا تھا:۔

"اے فاطمہ! چوں بمیرم روئے خود را برائے من مخراش وگیسوئے خود را پریشان مکن وواویلا مگو وبر من نوحہ مکن ونوحہ گراں مطلب"

ترجمہ:۔ اے فاطمہ! جب میری وفات ہو جائے تو میرے لئے چہرہ کو زخمی نہ کرنا۔ بالوں کو پراگندہ نہ کرنا۔ واویلا نہ مچانا۔ مجھ پر نوحہ نہ کرنا اور نہ ہی نوحہ کرنے والوں کو بلانا۔" (حیات القلوب جلد ۲ کیفیت وفات پیغمبر)

فروع کافی میں یہی حدیث بالفاظ ذیل مروی ہے:۔

"ان رسول اللّٰہ قال لفاطمۃ اذا انا متّ فلا تخمشی علیّ وجہاً ولا تنشری علیّ شعراً ولا تنادی بالویل ولا تقیمی علیّ ناحیۃً" (فروع کافی کتاب النکاح صفحہ ۲۲۸)

اس وصیت نبوی کے بعد کسی مسلمان کیلئے کب جائز ہے کہ وہ کسی کی موت پر ماتم کرے، سر نوچے، نوحہ کرے اور واویلا مچائے؟ پس شیعہ صاحبان کی "تعزیہ داری" پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اس وصیت کے بھی خلاف ہے جو آپ نے آخری وقت میں حضرت فاطمہ رض کو فرمائی تھی۔ ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء تھے اور آپ کا مقام اولین و آخرین سے بڑا ہے۔ جب آپ کے لئے نوحہ و ماتم کرنا منع ہے تو اور کون ہے جس کیلئے یہ افعال جائز ہیں؟

شہداء کے بارے میں ارشادات نبویؐ

ہم یہ سطور لکھ رہے تھے کہ شیعوں کے ایک غالی مولوی صاحب کا جواب ملا جو انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مندرجہ بالا

وصیت کا دیا ہے سامنے آگیا۔ آپ لکھتے ہیں:۔

"یہ حکم رسالتمآبؐ سے دراصل ان کی اپنی موت کا ہے اور حضورؐ کی موت طبعی ہے آپ ظلم اور جور سے شہید نہیں کئے گئے۔" (صداقت گوجرہ ۵ راگست ۱۹۵۶ء)

گویا یہ تو تسلیم کر لیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نوحہ اور ماتم سے منع کیا ہے اور اسے ناجائز قرار دیا۔ مگر شیعہ مولوی صاحب کے نزدیک یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مخصوص ہے امام حسینؓ پر بایں ہمہ نوحہ و ماتم کیا جائیگا۔ کیونکہ آنحضرت جور وظلم سے شہید نہیں ہوئے مگر حضرت امام حسینؓ جور وظلم سے شہید ہوئے ہیں۔

اوّل تو حضرت علی کرّم اللہ وجہہ کے مذکورہ بالا بیانات کے بعد ایسی بات لکھنا درحقیقت عدم معرفت مقام نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا ہی نتیجہ ہے۔ گویا محبت حضرت حسینؓ میں اتنا غلو ہے کہ سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ اِنّا للہ وانّا الیہ راجعون۔

دوم۔ ہم شیعہ مولوی صاحب کے اعتراض کی تردید کیلئے دو انتہائی مظلوم شہیدوں کے واقعہ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نمونہ اور حضور کے ارشاد کو پیش کرتے ہیں۔

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ جس ظالمانہ اور سفاکانہ طریق پر شہید ہوئے وہ تاریخ اسلام کا کھلا واقعہ ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر کیا اسوہ پیش کیا؟ لکھا ہے:۔

"ونزد امراو اظہار جزعے نکرد و آہے نکشید وآبے از دیدہ جاری نگردانید۔"

کہ اس موقع پر حضور علیہ السلام نے جزع فزع نہ کی آہیں نہ بھریں اور نہ رونے دھونے میں لگ پڑے۔"

(حیات القلوب جلد ۲ صفحہ ۱۷۵)

پھر جب حضرت جعفر بن ابی طالب شہید ہوئے تو حضور علیہ السلام نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا:۔

"لا تدعی بویل ولا ثکل ولا حزن"

کہ اے فاطمہ! واویلا نہ کرنا اور نہ ہی ماتم کرنا نہ واتکلاہ وغیرہ۔" (من لا یحضرہ الفقیہ جلد ۱ صفحہ ۵۶)

پس ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح اپنی وفات پر نوحہ و ماتم کرنے سے منع فرمایا تھا۔ اسی طرح آپؐ نے اپنے عزیز ترین رشتہ دار مجاہدین اسلام کی جور وظلم سے واقع ہونے والی شہادت پر بھی نوحہ و ماتم سے منع فرمایا ہے۔ باقی یہ الگ امر ہے کہ آج کے شیعہ صاحبان اپنی عادت یا اپنے غلو کے ماتحت رسول مقبولؐ کے ارشادات کو پس پشت پھینک دیں تو ان کی مرضی ہے۔

حضرت امام صادقؑ نے ایک شخص کو اس کے بچے کے مرنے پر تعزیت کی مگر وہ جزع فزع کرتا رہا۔ اس پر آپ نے فرمایا:۔

"قدمات رسول اللہ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم أفمالك به اسوة؟

کہ آنحضرتؐ وفات پا گئے ہیں کیا ان کے واقعہ میں تمہارے لئے نمونہ یا تعزیت نہیں ہے؟"

(من لا یحضرہ الفقیہ جلد ۱ صفحہ ۵۵)

حضرت امام ابوعبداللہؑ نے فرمایا ہے کہ جو شخص مبتلائے مصیبت ہو فلیذکر مصابه بالنبی صلی اللہ علیہ وسلم فانّه من اعظم المصائب۔ اسے چاہیئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے حادثہ عظیمہ کو یاد کر لے وہ سب سے بڑی مصیبت ہے۔ (فروع کافی کتاب الجنائز)

یہ تو ائمہ اطہار کا طریق تھا اور آج کے شیعوں کا وہ انداز ہے جو آپ اخبار "صداقت" کے اقتباس میں پڑھ آئے ہیں۔

میّت پر سوگ کا اسلامی طریق

ہم لکھ چکے ہیں کہ اسلام دین فطرت ہے کسی عزیز اور پیارے اور محسن کی وفات پر صدمہ ایک طبعی بات ہے۔ اسلام نے اس کے لئے یہ طریق مقرر فرمایا ہے کہ میّت پر اس کی موت کے بعد تین دن تک سوگ اور افسوس ہو سکتا ہے۔ بیوی کیلئے چار مہینے دس دن عدّت مقرر ہے۔

حضرت امام ابوجعفرؑ فرماتے ہیں:۔

"یصنع للمیت ماتم ثلاثۃ ایام من یوم مات"

کہ میت پر اس کی موت سے لیکر تین دن تک افسوس اور سوگ کی اجازت ہے۔ پھر بیوی کے استثناء کے بعد فرماتے ہیں:-

"لیس لاحد ان یحد اکثر من ثلاثۃ ایام"

کہ کسی کے لئے جائز نہیں کہ وفات کے بعد تین دن سے زیادہ سوگ کرے۔" (من لا یحضرہ الفقیہ جلد ۱ ص ۳۵)

اس شرعی طریق کو چھوڑ کر نوحہ و ماتم کرنا اور تعزیئے بناتے پھرنا غیر اسلامی طریقہ ہے۔

تعزیہ بنانا بدعت ہے

مندرجہ بالا بیانات سے عیاں ہے کہ قرآن مجید، احادیث نبویہ اور ائمہ کرام کے اقوال کے رُو سے جزع فزع کرنا۔ نوحہ کرنا۔ ماتم کرنا اور تعزیئے بنانا صریح بدعت ہے غیر اسلامی طریق ہے۔ یہ طریق نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے جاری ہوا۔ نہ آپ کے زمانہ میں جاری ہوا۔ نہ خلفاء اور ائمہ نے تعزیئے بنانے کا حکم دیا اور نہ ان کے زمانہ میں تعزیئے بنائے جاتے تھے۔ یہ سب کچھ بعد میں بطور بدعت سیاسی مقاصد کے لئے جاری ہوا ہے۔ حضرت امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں:-

"السنۃ ما سن رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم والبدعۃ ما احدث بعدہ"

کہ **سنت رسول** وہ ہے جو آنحضرت نے جاری فرمائی اور جو باتیں بعد میں ایجاد کر لی گئیں وہ **بدعت** ہیں۔" (بحار الانوار جلد ۱ ص ۲۲)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:-

"یا معشر المسلمین ان افضل الھدی ھدی محمد وخیر الحدیث کتاب اللہ وشر الامور محدثاتھا الا وکل بدعۃ ضلالۃ وکل ضلالۃ ففی النار"

اے مسلمانو! بہترین طریقہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے اور بہترین حدیث اللہ کی کتاب ہے۔ بدترین معاملات بدعتیں ہیں۔ ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی جہنم میں جانے کا باعث ہے۔" (بحار الانوار جلد ۱ ص ۲۱)

کیا تمام رونے والے مخلص ہوتے ہیں؟

کسی مقدس ہستی سے محبت کی یہ علامت نہیں کہ انسان اسکے مقام کے بارے میں غلو کرے اور اسے الوہیت کے عرش پر بٹھا دے جیسا کہ عیسائی کر رہے ہیں۔ پھر بعض لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ حضرت امام حسینؓ کے نام پر رونے والے ہی انکے سچے محب اور مخلص ہیں۔ ایسے لوگوں کو حضرت ام کلثومؓ کا قول یاد رکھنا چاہیئے۔ آپ نے کوفہ کی عورتوں کو مخاطب کر کے فرمایا۔

"اے اہل کوفہ! تمہارے مردوں نے ہم کو قتل کیا اور اب تمہاری عورتیں روتی ہیں۔ خداوند عالم بروز قیامت ہمارا تمہارا حاکم ہے۔" (جلاء العیون اردو جلد ۲ ص ۵۰۵)

کیا تعزیئے بنانے والے اسلام سے خارج نہیں؟

ہم مضمون کے آخر میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا نہایت واضح اور قطعی فتویٰ درج کرتے ہیں جس سے ظاہر ہے کہ انکے نزدیک تعزیئے وغیرہ بنانیوالے اسلام سے خارج ہیں۔ فرماتے ہیں:-

"من جدد قبراً او مثل مثالاً فقد خرج من الاسلام۔"

کہ جو شخص قبر کی تجدید کرتا ہے یا تابوت و تعزیہ وغیرہ بناتا ہے وہ اسلام سے خارج ہے۔" (من لا یحضرہ الفقیہ جلد ۱ ص ۶۰)

امید ہے کہ شیعہ بھائی مخلصانہ طور پر ان معروضات پر غور کرینگے جو شیعوں کی مسلم کتب کے حوالہ جات سے پیش کی گئی ہیں۔

واخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العالمین

اُمّتِ مُسلمہ کا امتیازی شرف

(اور)

موجودہ زمانہ میں اس کی از سرِ نو بحالی

(از جناب مسعود احمد خانصاحب دہلوی - بی - اے)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مرکزی تنظیم کے تحت تبلیغ اسلام کا جو عظیم الشان نظام قائم کیا تھا وہ خلافتِ راشدہ کے بعد اس شان کے ساتھ جاری نہ رہ سکا جس شان سے اس کا جاری رہنا ضروری تھا۔ اس سے ہماری مراد ہرگز یہ نہیں ہے کہ خلافتِ راشدہ کے معاً بعد دُنیا میں اسلام کی تبلیغ کا سلسلہ بند ہو گیا۔ یہ سلسلہ تو بے شک جاری رہا اور دُنیا کے دُور دراز ممالک میں بھی اسلام کی اشاعت ہوتی رہی۔ لیکن ان تبلیغی مساعی میں مرکزیت قائم نہ رہ سکی۔ اور اس اہم ترین فریضہ کی ادائیگی بعض برگزیدہ انسانوں اور مخصوص بندگانِ خدا کی انفرادی کوششوں تک ہی محدود ہو کر رہ گئی۔ اگر حضرت معین الدین چشتیؒ، حضرت بابا فرید شکر گنجؒ، حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ اور اسی قبیل کے دوسرے بزرگانِ دین اور اسلام کا درد رکھنے والے عرب تاجر انفرادی طور پر اپنے گھروں سے نکل نہ کھڑے ہوتے اور اپنے وطنوں کو خیرباد کہہ کر دُنیا کے دوسرے علاقوں میں اسلام کا پیغام نہ پہنچاتے تو یقیناً مسلمانوں کو غلبہ و حکومت مل جانے کے باوجود مشرق و مغرب کی بہت سی اقوام تک اسلام کا پیغام نہ پہنچتا اور آج ان اقوام میں اسلام کا کوئی نام لیوا نظر نہ آتا۔ مرکزی تنظیم موجود نہ ہونے کے باعث رفتہ رفتہ انفرادی کوششوں کا یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا اور اُمّتِ مسلمہ اس اہم فریضے کی ادائیگی سے یکسر غافل ہو گئی حالانکہ اس فریضہ کی ادائیگی پر اُمّتِ مسلمہ کے لئے "خیر اُمّت" کہلانے کا شرف منحصر تھا۔ جیسا کہ قرآن مجید کی آیت کنتم خیر اُمّۃٍ اُخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنھون عن المنکر سے ظاہر ہے۔ اس فریضہ کی ادائیگی سے یکسر غافل ہو جانے کی صورت میں اس امتیازی شرف کا قائم رہنا ممکن نہ تھا۔ جیسا کہ مولانا ابوالکلام آزاد تحریر فرماتے ہیں :-

> "مسلمانوں کا بہترین اُمّت ہونا صرف ان کے اس وصف پر منحصر ہے کہ وہ آمر بالمعروف اور ناہی عن المنکر ہیں۔ خیر کی دعوت دیتے ہیں اور شر سے روکتے ہیں۔ اور یہیں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر یہ وصف امتیازی ان سے جاتا رہے تو وہ بہترین اُمّت ہونے کے شرف سے بھی محروم ہو جائیں۔" (کتاب "امر بالمعروف" صفحہ ۲۶ شائع کردہ الہلال بک ایجنسی لاہور)

چنانچہ اس شرف سے محروم ہو جانے کا حال بھی مولانا آزاد کی زبانی سُنیئے۔ آپ تحریر فرماتے ہیں :-

> "امر بالمعروف جو دراصل ہر فرد کا اسلامی فرض تھا وہ روز بروز ایک محدود دائرے میں سمٹتا گیا اور سمٹتے سمٹتے ایک غیر محسوس

نقطہ بن کر رہ گیا۔ اب اس کے وجود میں بھی شک ہے۔" (ص۳۹)

یہی نہیں، مولانا آزاد اس غلط خیال کی تردید کرتے ہوئے کہ تبلیغ کرنا صرف چند مخصوص لوگوں کا کام ہے مزید لکھتے ہیں:-

"اسلام کی وہ دعوتِ الہٰی جو ایک عالمگیر اصلاح اور بین المللی جامعہ کے قیام کے لئے آئی تھی اسی غلط فہمی سے زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکی۔ خلافت و نیابتِ الہٰی کا وہ شرف جو مسلمانوں کو عطا کیا گیا تھا اور جس کی وجہ سے بحیثیت ملّی وہ تمام عالم میں خدا کا مقدس دستِ عمل تھے بدبختانہ اسی غلط فہمی سے خاک میں ملا۔" (ص۳۷)

اس اقتباس کی شرف سے محرومی کا ایک افسوسناک پہلو یہ بھی ہے کہ عین اس وقت جبکہ مسلمان اس اہم فریضہ کی ادائیگی سے یکسر غافل ہو چکے تھے عیسائیوں میں تبلیغ کا ایک نیا جوش پیدا ہوا۔ اور انہوں نے نہایت منظم طریق پر عیسائیت کی تبلیغ کو وسیع کر کے ساری دنیا کو اپنے "خیالی خداوند" کا مطیع و منقاد بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ انیسویں صدی عیسوی میں ان کی یہ کوششیں اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئیں اور مغربی ممالک سے عیسائی پادریوں کے غول کے غول نکل کر مشرق و مغرب پر اس طرح چھا گئے جس طرح سیاہ بادل آسمان پر چھا جاتے ہیں۔ ان کے حوصلے کس قدر بلند تھے اور ان کے سینے کیسی کیسی توقعات کا مسکن بنے ہوئے تھے۔ اس کا اندازہ انیسویں صدی عیسوی کے عیسائی لٹریچر سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ہم ایک مشہور امریکی پادری کے بعض لیکچروں کے اقتباسات ذیل میں پیش کرتے ہیں۔ جن سے انیسویں صدی کے اواخر میں عیسائیت کے اُمڈتے ہوئے سیلاب کی شدت اور اس کے بڑھتے ہوئے زور کا کسی قدر اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہ امریکن پادری مسٹر جان ہنری بیروز (John Henry Barrows) ہیں۔ وہ ایک زمانہ میں شکاگو یونیورسٹی میں مذاہبِ عالم کے پروفیسر تھے۔ انہوں نے ۱۸۹۶ء میں ہندوستان کا دورہ کیا اور یہاں کے بڑے بڑے شہروں میں متعدد لیکچر دیئے جو بعد میں "Barrows Lectures" کے نام سے شائع ہوئے ان کے دورے کا مقصد یہ تھا کہ وہ ان لیکچروں کے ذریعہ برصغیر کے رہنے والوں کو خبردار کریں کہ مسیحیت عنقریب ساری دنیا پر غالب آنے والی ہے۔ اور دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہ رہے گا کہ جس کے رہنے والے یسوع مسیح کی غلامی میں داخل ہو کر اسے اپنا نجات دہندہ تسلیم کرنے پر مجبور نہ ہو جائیں۔ چنانچہ اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے اپنے ایک لیکچر میں اعلان کیا:-

"عیسائی تہذیب کا پانی عرصۂ دراز سے یورپ اور امریکہ کی بلند سرزمین پر جمع ہو رہا تھا۔ اب اچانک اس میں سے ایک طاقتور دریا پھوٹ نکلا ہے اور تیزی سے افریقہ کی پیاسی زمینوں ہندوستان کے میدانوں اور مسیحی سلطنت کے نئے نئے علاقوں کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس اُمڈتے ہوئے سیلاب کے شور میں ہم میں سے بعض لوگ حزقی ایل نبی کے اس مکاشفہ کو پورا ہوتے دیکھ رہے ہیں جس میں حزقی ایل کو ایک مقدس دریا دکھایا گیا تھا۔ یہ دریا مشرق کی طرف بڑھیگا اور صحراؤں کو سیراب کرتا ہوا سمندر میں جا ملے گا اور اپنی تاثیر سے سمندروں کے کڑوے پانی کو بھی شیریں بنا دے گا۔"

(Barrows Lectures
Page. 23)

مذکورہ بالا الفاظ میں یہ خبر دینے کے بعد کہ عنقریب افریقہ، ہندوستان اور مشرق کے دوسرے ممالک عیسائیت کی آغوش میں آنے والے ہیں انہوں نے اپنے ایک اور لیکچر میں خاص طور پر اسلامی ممالک کا ذکر کرتے ہوئے کہا:۔

"اب میں تمہیں اسلامی ممالک میں عیسائیت کی اٹھتی ہوئی تحریک کا کچھ حال بتاتا ہوں۔ صلیب کی چمکار کی مدد سے آج یہ تحریک ایران اور لبنان کے پہاڑوں سے ٹکرا رہی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس چمکار کی کرنیں بالسفورس کی سطح پر بھی جلوہ فگن ہیں۔ یہ صورت حال اس مبارک دن کا پیش خیمہ ہے کہ جب بالآخر قاہرہ، دمشق اور تہران خداوند یسوع مسیح کی غلامی میں داخل ہوں گے۔ نہیں نہیں صلیب کی کرنیں ریگستان عرب کی خاموش فضاؤں کو چیرتی ہوئی وہاں (اسلام کے مولد و مسکن میں) بھی جا پہنچیں گی۔ اور یسوع اپنے شاگردوں کی شکل میں مکہ اور کعبہ میں داخل ہوگا۔ اور بالآخر وہاں کھلے طور پر حق و صداقت کے اس پیغام کی منادی کی جائے گی "ابدی زندگی یہی ہے کہ لوگ تجھ خدا کو جان لیں اور یسوع مسیح پر ایمان لے آئیں کہ جس کو تو نے بھیجا ہے۔" (ص۴۲)

انیسویں صدی میں عیسائیت کو جو عروج حاصل ہوا اس کا تفصیل سے ذکر کرنے کے بعد مسٹر بیرو نے کمال درجہ تعلی کے رنگ میں مزید کہا:۔

"انیسویں صدی میں عیسائیت کو جو عروج حاصل ہوا ہے بہت سے عیسائیوں کی نگاہ میں تو وہ عیسائیت کی ان فتوحات کی ایک مدھم جھلک ہے جو اسے بیسویں صدی میں ملنے والی ہیں۔" (ص۲۳)

پھر انیسویں صدی میں عیسائیت کی فتح کا نقارہ بجانے والے اسی پادری نے اسلام کا نہایت حقارت سے ذکر کرتے ہوئے کہا۔

"اسلام ایک مشرقی مذہب ہے یہ مغرب کی فضا میں سانس نہیں لے سکتا اور نہ ہی یہ ہمارے مغربی ذہنوں کو کسی صورت راس آسکتا ہے۔" (ص۲۱)

ان اقتباسات سے انیسویں صدی کے آخر میں مسلمانوں کی بے کسی کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے تبلیغ کے اہم ترین فریضے سے غفلت کے باعث مسلمانوں پر مایوسی چھائی ہوئی تھی۔ اور یورپ و امریکہ کے عیسائی پادری اسلام کو دنیا سے نیست و نابود کرنے کے لئے لافیں مار رہے تھے۔ مسلمانوں کی اس بے بسی اور بے کسی پر اللہ تعالیٰ کی غیرت جوش میں آئی اور اس نے بانی سلسلہ احمدیہ حضرت مرزا غلام احمد قادیانی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو مبعوث فرما کر دنیا میں مرکزی تنظیم کے تحت تبلیغ اسلام کے ایک وسیع نظام کی بنیاد ڈالی اور آپ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:۔

"میں تیرا تبلیغ کو زمین کے کناروں تک پہنچاؤں گا۔"

نیز فرمایا کہ یہ سب کچھ تیرے ایک موعود فرزند کے ہاتھوں ہوگا جو اسی نسبت سے

(۱) "زمین کے کناروں تک شہرت پائے گا۔"

اور یہ کہ:۔

(۲) "قومیں اس سے برکت پائیں گی۔"

سو آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ کہ اسی پسر موعود یعنی جماعت احمدیہ کے موجودہ امام سیدنا حضرت المصلح الموعود ایدہ اللہ الودود کے ذریعہ مرکزی تنظیم کے تحت دنیا کے کونے کونے میں اسلام کا پیغام پہنچ رہا ہے۔

دُنیا کا وہ کونسا علاقہ ہے جہاں آپ کے بھیجے ہوئے خدام اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کی منادی نہیں کر رہے وہ کام جو خلافتِ راشدہ کے بعد تیرہ سو سال میں آجتک پورے طور پر نہ ہو پایا تھا وہ آج انہی بشارتوں کے عین مطابق اسی موعود فرزند کے ذریعہ انجام پا رہا ہے۔ اور اس شان سے انجام پا رہا ہے کہ اپنے اور پرائے سب عش عش کر اُٹھے ہیں۔ حتیٰ کہ اہلِ مغرب بھی جو اسلام کو ایک مشنری مذہب گردانے کے روادار ہی نہ تھے اور اس کی اشاعت کو تلوار کا مرہون قرار دینے میں جن کی زبانیں کبھی تھکتی ہی نہ تھیں اب یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ دنیا میں اسلام کے دوبارہ غالب آنے کے آثار نمایاں ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کے نزدیک ان آثار میں جماعتِ احمدیہ کی منظم تبلیغی مساعی کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ چنانچہ مغرب کے بڑے بڑے نامور مؤرخ، عیسائی پادری اور وہاں کے لاکھوں کی تعداد میں چھپنے والے اخبارات و رسائل بڑی تشویش کے ساتھ اس خدشے کا اظہار کر رہے ہیں کہ اسلام دُنیا میں ایک دفعہ پھر غالب آئے بغیر نہ رہے گا۔ وہ دیکھ رہے ہیں کہ احمدی مبلغین کی مجاہدانہ کوششوں کے بالمقابل ہر جگہ عیسائیت پسپا ہو رہی ہے اور اس کی جگہ اسلام آگے بڑھ رہا ہے۔ بالخصوص عیسائی پادریوں کو اس سوال نے پریشان کر رکھا ہے کہ دُنیا میں صلیب کے قبضہ کو کس طرح برقرار رکھا جائے کیونکہ "صلیب" کی بجائے اب "ہلال" کا نشان دن بدن نمایاں ہوتا جا رہا ہے۔

قبل اس کے کہ ہم عیسائی پادریوں کی تشویش اور اسلام کی طرف اہلِ مغرب کے میلان کے متعلق مغربی مصنفین کے بعض حوالے پیش کریں۔ یہ ضروری ہے کہ مسٹر ہنری بیروز کی تقاریر کے جو اقتباسات ہم اُوپر درج کر آئے ہیں ان کا خلاصہ ذیل میں پھر درج کر دیں۔ تاکہ سیدنا حضرت المصلح الموعود ایدہ اللہ الودود کے ذریعہ دنیا کے کونے کونے میں آج اسلام کی تبلیغ جس منظم طریق پر ہو رہی ہے اور اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے ماتحت دُنیا میں جو زبردست انقلاب رونما ہو رہا ہے اور اُمتِ مُسلمہ کے امتیازی شرف کی بحالی جس مہتم بالشان طریق پر عمل میں آ رہی ہے اس کا کما حقہٗ احساس دلوں میں گھر کر سکے سو آج سے ساٹھ سال قبل تبلیغ کے بارے میں مسلمانوں کی انتہائی افسوسناک غفلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مسٹر ہنری بیروز نے برِصغیر کی سرزمین پر یہ اعلان کیا تھا:۔

۱۔ عیسائیت کا سیلاب مغرب سے مشرق کی طرف اُمڈتا چلا آ رہا ہے۔ افریقہ، ہندوستان اور مشرقِ بعید کے دوسرے علاقے اب اس کی لپیٹ میں آئے بغیر نہ رہیں گے۔

۲۔ وہ دن دُور نہیں ہے کہ جب (نعوذ باللہ) قاہرہ، دمشق اور تہران خداوند یسوع مسیح کی غلامی میں داخل ہونگے اور عیسائی پادری مکہ میں فاتحانہ طریق سے داخل ہو کر خاص بیت اللہ میں دینِ مسیحی کی صداقت کا اعلان کرینگے۔

۳۔ انیسویں صدی میں عیسائیت کو دُنیا میں جو فتوحات حاصل ہوئی ہیں وہ ان فتوحات کا عشرِ عشیر بھی نہیں ہیں جو اسے بیسویں صدی میں ملنے والی ہیں۔

۴۔ مغرب میں اسلام کا پھیلنا قطعاً ناممکن ہے کیونکہ یہ مغربی ذہنوں کو کسی صورت راس نہیں آ سکتا۔

۱۸۹۶ء میں جب مسٹر ہنری بیروز عیسائیت کی فتوحات کے نشہ میں سرشار ہو کر سرزمینِ ہند پر یہ دلخراش اعلان کر رہے تھے تو آسمانی تقدیر عیسائیوں کی اس لاف زنی پر ہنس رہی تھی کیونکہ ہی خدا جس نے قرآن مجید اور اسلام کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہوا تھا اپنے مسیح موعود کو جری اللہ فی حلل الانبیاء کے طور پر مبعوث فرما کر دُنیا بھر میں تبلیغِ اسلام کے ایک وسیع نظام کی بنیاد ڈال چکا تھا۔ اور مسیح موعودؑ کا وہ موعود فرزند بھی پیدا ہو چکا تھا کہ جس کے ذریعہ تبلیغ و اشاعتِ اسلام کا یہ عظیم الشان

کام پایۂ تکمیل کو پہنچا تھا اور اُمّتِ مسلمہ کا امتیازی شرف پوری شان کے ساتھ پھر بحال ہونا تھا۔ یہ اسی موعود فرزند کی اولوالعزمی اور فہم و فراست کا نتیجہ ہے کہ آج وہی عیسائیت جو بیسویں صدی میں اُنیسویں صدی سے بھی بڑھ کر فتوحات حاصل کرنیکی توقع لگائے بیٹھی تھی مبلغینِ اسلام کے حملوں کی تاب نہ لا کر ہر جگہ پسپا ہو رہی ہے اور کلیسا میں ایک شور برپا ہے کہ وہ اپنے اُکھڑتے ہوئے قدموں کو کیونکر جمائے۔ مسٹر ہنری بیرونز نے عیسائیت کی متوقع فتوحات میں سب سے پہلے افریقہ کا ذکر کیا تھا۔ اور کہا تھا کہ عنقریب افریقہ کی پیاسی سرزمین عیسائیت کے پانی سے سیراب ہونے والی ہے۔ ہم بھی ذیل میں سب سے پہلے افریقہ میں ہی اسلام کی ترقی اور عیسائیت کی خطرناک شکست کا کچھ حال بیان کرتے ہیں اور وہ بھی خود عیسائی پادریوں کی زبانی :۔

انگلستان کے اخبار "مانچسٹر گارڈین" میں پچھلے دنوں مسٹر جے۔ ایچ۔ پرائس (J. H. Price) کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جسے "ڈیلی ٹائمز" نائیجیریا نے بھی اپنے ۱۲ر جولائی ۱۹۵۶ء کے پرچہ میں نقل کیا ہے۔ اس مضمون میں مسٹر پرائس گولڈکوسٹ میں جماعتِ احمدیہ کی تبلیغی سرگرمیوں اور ان کے شاندار نتائج کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"مالکیوں کے علاوہ مسلمانوں کا ایک فرقہ **جماعتِ احمدیہ** بھی ہے جو اپنی تبلیغی مساعی کے لحاظ سے بہت مشہور ہے۔ اس کا مرکز پاکستان میں ہے۔ جماعتِ احمدیہ کا نفوذ مغربی افریقہ میں ۱۹۲۰ء میں ہوا۔

یہ جماعت تیزی کے ساتھ ترقی کے راستے پر گامزن ہے۔ عیسائیوں اور مشرکین دونوں میں سے لوگ اس میں داخل ہو رہے ہیں۔ اس جماعت کی رفتارِ ترقی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ۱۹۳۱ء میں اس کے اراکین کی تعداد ۳۱۱۰ تھی جبکہ ۱۹۴۸ء میں یہ تعداد ۲۲۵۷۲ تک پہنچ گئی۔

اس جماعت کی نمایاں کامیابی میں اس کی تعلیمی سرگرمیوں کا بھی دخل ہے۔ جس میں ثانوی تعلیم بھی شامل ہے۔ ان تعلیمی مساعی کو مغربی افریقہ کے تمام علاقوں میں محسوس کیا جا رہا ہے۔"

اسی طرح یونیورسٹی کالج گولڈکوسٹ کے ایک پروفیسر مسٹر ایچ۔ جی۔ ولیمسن (H. G. William Son) اپنی کتاب "یسوع یا محمدؐ" (Christ or Mohammad) کے تعارفی نوٹ میں لکھتے ہیں :۔

"گولڈکوسٹ کے بعض جنوبی حصّوں میں خصوصاً ساحل کیساتھ ساتھ احمدیہ جماعت کو اہم فتوحات حاصل ہو رہی ہیں۔ یہ توقع کہ گولڈکوسٹ جلد ہی عیسائیت کی آغوش میں آجائے گا اب معرضِ خطر میں ہے اور یہ خطرہ ہمارے خیال کی وسعتوں سے کہیں زیادہ عظیم ہے۔"

آگے چل کر وہ مزید لکھتے ہیں :۔

"ڈاکٹر پارنڈر کے قول کے مطابق نائیجیریا کے جنوبی علاقے میں جہاں مشرکانہ عقائد دم توڑ رہے ہیں وہاں اب اسلام

پیروؤں کو اکثریت حاصل ہوتی جا رہی ہے اور ان کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ گولڈ کوسٹ کی ۱۹۴۸ء کی مردم شماری کے مطابق وہاں احمدیہ فرقہ کی تعداد ۲۲۵۷۲ افراد پر مشتمل ہے۔ جبکہ ۱۹۳۱ء میں ان کی تعداد صرف ۳۱۱۰ تھی۔ اس سے عیاں ہے کہ سترہ سال کے عرصہ میں ان کی تعداد میں سات گنا اضافہ ہوا ہے ...... یہ زیادتی ہمارے لئے اچھی خاصی پریشان کن ہے۔ خود عیسائی مناد وں کی رپورٹوں سے جو آجکل میدانِ تبلیغ میں برسرِکار ہیں ظاہر ہوتا ہے کہ اس فرقہ کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔"

مسٹر ولیمسن نے آگے چل کر افریقہ کے علاوہ دیگر ممالک میں بھی جماعتِ احمدیہ کی تبلیغی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی ہے۔ اور اس بنا پر ان ممالک میں بھی عیسائیت کو جو زبردست خطرہ لاحق ہے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:۔

"احمدیہ جماعت ہندوستان و افریقہ کے علاقوں میں وسیع پیمانہ پر پھیل چکی ہے۔ ان کے تبلیغی مراکز کی فہرست دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ یورپی ممالک میں سے لندن، پیرس، میڈرڈ، ہیگ اور زیورچ میں ان کے مشن قائم ہیں۔ اسی طرح امریکہ میں شکاگو، پٹس برگ، بوسٹن اور دیگر میں بھی ان کے مشن قائم ہو چکے ہیں۔ سویز کے مشرق میں ان کے تبلیغی مراکز عدن، کولمبو، تہران، سنگاپور، جاوا اور سماٹرا میں موجود ہیں۔ اسی طرح مشرقی افریقہ میں بھی ان کا اثر بڑھ رہا ہے۔ مغربی افریقہ میں انکا مرکز نائیجیریا ہے ...... اس کی تمام قوتیں عیسائیت کو تباہ کرنے پر صرف ہو رہی ہیں۔ اس نے اپنی تنظیم کو جدید لائنوں پر ڈھال لیا ہے جس کی وجہ سے اس کے مبلغ اور مناد ساری دنیا میں جاتے ہیں۔ جو تعلیم یافتہ ہونے کے علاوہ عیسائیت کے رد اور اپنے عقائد کو رواج دینے کے سلسلے میں ہر طرح کے ہتھیاروں سے پوری طرح لیس ہوتے ہیں۔ یہ تحریک نشر و اشاعت کے تمام طریقوں سے فائدہ اٹھاتی ہے۔ اس کے اپنے پریس ہیں جن میں ان کا اپنا لٹریچر، اخبارات اور رسائل چھپتے ہیں۔ خود بہت سے قارئین کے پاس بھی اس جماعت کا مطبوعہ اور سائیکلوسٹائلڈ لٹریچر موجود ہوگا۔ جا بجا ان کے سکول قائم ہیں اور ان میں ایسے سکول بھی ہیں جن میں ثانوی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ نوجوانوں کا ایک طبقہ اس تحریک کی طرف مائل ہو رہا ہے۔ اسلئے یہ نہایت ضروری ہے کہ اس تحریک کے متعلق معلومات حاصل کی جائیں۔ اور اس پر سنجیدگی سے غور کیا جائے اور اس کا حل تلاش کیا جائے۔"

عیسائی پادریوں اور مستشرقین کے علاوہ امریکہ کے مشہور رسالے "لائف" نے جو لاکھوں کی تعداد میں چھپتا اور ساری دنیا میں پڑھا جاتا ہے پچھلے دنوں جماعتِ احمدیہ کی تبلیغی سرگرمیوں سے متاثر ہو کر ایک قیمتی مضمون شائع کیا تھا جس میں احمدی مجاہدینِ اسلام کی جدوجہد سے متعلق بعض رنگین تصاویر شائع کرنے کے بعد اس نے لکھا:۔

"اسلام کے بعض فرقوں میں زندگی اور قوت کے آثار دن بدن نمایاں ہو رہے ہیں۔

ان میں سب سے زیادہ پیش پیش ایک نیا فرقہ ہے جو جماعت احمدیہ کے نام سے موسوم ہے۔ اس کا صدر مقام پاکستان میں ہے اور یورپ، افریقہ، امریکہ اور مشرق بعید کے ممالک میں اس کے باقاعدہ تبلیغی مشن قائم ہیں۔ ہم نے یہاں جو تصاویر درج کی ہیں ان سے افریقہ میں ان کی تبلیغی مساعی کا کسی قدر اندازہ ہو سکتا ہے۔"

("لائٹ" مورخہ ۱۵ اگست ۵۵ء)

رسالہ مذکور لکھتا ہے:۔

"قادیانی جماعت کا جس نے افریقہ کو خاص طور پر اپنی توجہ اور جد و جہد کا مرکز بنا رکھا ہے۔ دعویٰ ہے کہ وہ اب تک وہاں ساٹھ ہزار باشندوں کو اسلام میں داخل کر چکی ہے۔" (")

آخر میں احمدی مجاہدین کے بالمقابل عیسائیت کی بیکسی و ناکامی کا ذکر کرتے ہوئے وہ اس مضمون میں لکھتا ہے۔

"افریقہ میں لاکھوں لاکھ حبشی باشندے جن کی تعداد وہاں کی اصل آبادی کے پانچویں حصہ کے برابر ہوگی اسلام قبول کر چکے ہیں۔ بعض علاقوں میں جہاں آجکل عیسائی مشنری اور مسلمان مبلغ ایک دوسرے کے بالمقابل اپنے اپنے مذہب کی اشاعت میں مصروف ہیں۔ حالت یہ ہے کہ عیسائیت قبول کرنے والے ایک شخص کے مقابلے میں دس حبشی اسلام قبول کرتے ہیں۔ یہ امر خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ مغربی افریقہ میں اب اسلام کو واضح طور پر حبشیوں کا مذہب قرار دیا جاتا ہے جبکہ عیسائیت وہاں صرف سفید فام لوگوں کا مذہب بن کر رہ گئی ہے۔" (")

یہ کتنا عظیم الشان انقلاب ہے کہ وہی افریقہ جسے آج سے ساٹھ سال پہلے عیسائیت اپنا شکار سمجھتی تھی اور جہاں عیسائی منادوں کے بالمقابل اسلام کی تبلیغ کرنے والا کوئی ایک دردمند مسلمان بھی نظر نہ آتا تھا آج اسی "فرزند موعود" کے عظیم الشان کارناموں کی بدولت کہ جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اپنے الہام میں فرمایا تھا ــــ "نور آتا ہے نور جسے ہم نے اپنی رضامندی کے عطر سے ممسوح کیا" نور اسلام سے جگمگا رہا ہے اور وہ عیسائی پادری جو نعوذ باللہ فاتحانہ انداز میں کعبہ میں داخل ہونے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ آج افریقہ میں بھی اپنی صف لپیٹنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔

اب ہم مغربی ممالک میں تبلیغ اسلام اور اسکے نتیجے میں رونما ہونے والے انقلاب کا کچھ حال بیان کرتے ہیں۔ انہی مغربی ممالک میں کہ جن کے متعلق آج سے ۶۰ سال قبل مسٹر ہنری بیرونز نے کہا تھا۔ اسلام ایک مشرقی مذہب ہے۔ یہ مغرب کی فضا میں سانس لے ہی نہیں سکتا اور مغربی دماغوں کو اس کا رام آنا محال ہی نہیں ناممکن ہے۔ آج انہی مغربی ممالک کے بڑے بڑے شہروں میں جماعت کے باقاعدہ تبلیغی مشن قائم ہیں اور ان کی مجاہدانہ کوششوں کے نتیجے میں ایسی ایسی مخلص جماعتیں قائم ہو چکی ہیں کہ جن کے افراد دن رات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے اور خدائے واحد کے آگے دن میں پانچ وقت سجدہ ریز ہونے کو سعادت عظمیٰ سمجھتے ہیں اور اپنے کمائے ہوئے اموال میں سے دل کھول کر

چندہ دیا اور غلبۂ اسلام کے لئے انتھک کوشش کرنا ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ آج واشنگٹن، نیویارک، پٹس برگ، لندن، ہیگ، ہمبرگ، زیورچ اور گوتھنبرگ میں اور اسی طرح ڈچ گی آنا، برٹش گی آنا اور ٹرینیڈاڈ میں سیدنا حضرت المصلح الموعود ایدہ اللہ الودود کے خدام دیوانہ وار اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کی منادی کر رہے ہیں ان کی انتھک تبلیغی مساعی کی وجہ سے آج وہاں اتنا عظیم الشان انقلاب رونما ہو چکا ہے کہ وہاں کا سمجھدار اور تعلیم یافتہ طبقہ دن بدن عیسائیت سے بیزار ہو کر ابدی نجات کیلئے اسلام کیطرف دیکھ رہا ہے۔ وہ زمانہ اب گزر چکا کہ جب مستشرقین بالعموم اسلام اور بانیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف زہر آلود تحریریں لکھ لکھ کر اپنے دلی تعصب کا اظہار کیا کرتے تھے۔ اب وہاں مستشرقین کا ایک طبقہ ایسا پیدا ہو چکا ہے جو کھلے طور پر اسلام کی بعض خوبیوں کا اعتراف کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا۔ چنانچہ ان کی ذہنیتوں میں تبدیلی اور اسلام کی طرف میلان کا کسی قدر اندازہ ریڈرز ڈائجسٹ میں جیمز اے۔ مچنر کے مقالے — "Islam the 'mis-understood Religion"

"ورلڈ فیتھ" مصنفہ روتھ کرنسٹن، "دی بریج ٹو اسلام" مصنفہ ای۔ ڈبلیو۔ بیتھمن اور اسی قسم کی بعض دوسری کتابوں سے لگایا جا سکتا ہے جو حال ہی میں شائع ہوئی ہیں اور جن میں اسلام کی بعض خوبیوں کا کھلے بندوں اعتراف کیا گیا ہے۔

مغربی اقوام کی ذہنیتوں میں یہ تبدیلی عوام کی نگاہ میں شاید اتنی اہم نہ ہو لیکن وہاں کے اہل فہم حضرات اس تبدیلی کو شدت سے محسوس کر رہے ہیں اور انہیں نظر آ رہا ہے کہ بالآخر اسلام دُنیا میں غالب آ کر رہے گا چنانچہ برطانیہ کا نامور ترین فلسفی و مورخ آرنلڈ جے۔ ٹوئین بی جس کے فہم و فراست کی ایک دُنیا قائل ہے مغربی ممالک میں جماعت احمدیہ کی تبلیغی مساعی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اسلام میں ایک ایسی حرکت کے آثار نمایاں ہیں کہ جو بالآخر گری ہوئی قوموں کو اوج ثریا پر پہنچانے کا موجب ہوا کرتی ہے۔ مسٹر ٹوئین بی کا کہنا ہے کہ جب بڑے بڑے تہذیبی نظام آپس میں ٹکرا کر دُنیا کو تباہی کے قریب لے آتے ہیں تو پسماندہ قوموں میں نہایت برتر نوعیت کی خالص مذہبی تحریکیں اُٹھ کر دُنیا کو امن و سلامتی کی دعوت دیتی اور ایک نئے روحانی انقلاب کی بنیاد ڈالتی ہیں جیسا کہ یونانی اور رومی تہذیبوں کے باہمی تصادم کے وقت مسیح ناصری نے مبعوث ہو کر دُنیا کو آسمانی بادشاہت کا پیغام دیا تھا۔ چونکہ یہ تحریکیں باقتضائے وقت حکومتوں اور دنیوی جاہ و جلال سے کوئی علاقہ نہیں رکھتیں اسلئے یہ آہستہ آہستہ ترقی کرتی ہیں اور صدیوں کی جدوجہد کے بعد دُنیا پر غالب آتی ہیں۔ یہ امر تفصیل سے بیان کرنے اور تواریخ قدیم سے اس کی مثالیں پیش کرنے کے بعد مسٹر ٹوئین بی اس زمانے کے مخصوص حالات میں جماعتِ احمدیہ کی تبلیغی مساعی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"مستقبل میں رونما ہونے والے واقعات کے متعلق عمومی رنگ میں ہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور بالخصوص جہاں تک زمانہ آئندہ کے خاص خاص واقعات اور ان کی مخصوص نوعیت کا تعلق ہے ہمارے قیاسات قریب ترین مستقبل کی حد سے آگے نہیں جا سکتے اور ایسے واقعات کے بھی ہم صرف خفیف سے سائے ہی دیکھ سکتے ہیں۔ پھر بھی وہ تاریخی مثالیں جنہیں ہم نے مشعل راہ بنایا ہے ان سے ہمیں اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ وہ مذہبی تحریکیں جو مختلف تہذیبی نظاموں کے تصادم کے وقت معرض وجود

(باقی صفحہ پر)

مولانا مودودی کی "انقلابی دعوت"

[حال ہی میں پروفیسر محمد سرور صاحب ایم اے نے مولانا مودودی کی "تحریک اسلامی" کے عنوان سے ایک مفصل اور قیمتی کتاب شائع کی ہے۔ آپ نے اس کتاب میں اس تحریک کی تاریخ اور اسکے نشیب و فراز پر غیر جانبدارانہ تبصرہ فرمایا ہے۔ کتاب بہت دلچسپ اور قیمتی معلومات سے لبریز ہے۔ ذیل کا اقتباس اسی کتاب کا ایک حصہ ہے :- (ایڈیٹر)]

سنہ ۱۹۲۸ء تک مولانا مودودی جمعیت العلماء ہند کے اخبار "الجمعیت" کے ایڈیٹر رہے۔ اس زمانے میں جمعیت العلماء کی پالیسی بین بین تھی۔ وہ کانگرس کے ساتھ بھی تھی اور اسے مسلمانانِ ہند کو بطور ایک مستقل سیاسی وجود کے منوانے پر اصرار بھی تھا۔[1] مودودی صاحب کی اس زمانے کی ایک تحریر سے اس امر کی مزید وضاحت ہوتی ہے۔ لکھتے ہیں :-

"جمعیت العلماء کو اس طرف جلدی توجہ کرنی چاہیئے اور ایسی راہ بتلانی چاہیئے۔ جس میں نہ تو آزادی کی جدوجہد میں ملک اور قوموں سے علیحدہ ہوں اور نہ خلافت اسلامیہ اور مقامات مقدسہ کے مطالبے سے عملاً دست بردار ہوں۔ یہ مہلک غلطی ہوگی اگر ہم آزادی کے نام پر اپنی انفرادیت کو قربان کر دیں ...... اور یہ بات واضح ہو جانی چاہیئے۔ کہ ہم اول و آخر مسلمان ہیں۔ اور اپنی اسی حیثیت کے استقرار کے ساتھ ہم آزادی کی جدوجہد میں حصہ لینگے۔ —— اول و آخر ہندوستانی یا اول ہندوستانی اور پھر سب کچھ۔ اس قسم کے نظریے ہمارے لئے قطعاً ناقابل قبول ہیں۔" (مولانا مودودی کا اپنا اور دوسروں کی نظر میں۔ یہ سنہ ۱۹۲۷ء سنہ ۱۹۲۸ء کے زمانے کا اقتباس ہے۔)

سنہ ۱۹۲۳ء کے بعد ہندو مسلم اختلافات بڑھتے ہی چلے گئے، اور دونوں کی آپس میں سر پھٹول ہندوستان کی سیاست کا ایک معمول عام بن گیا۔ سنہ ۱۹۲۶ء کے آخر میں مشہور آریہ سماجی لیڈر سوامی شردھانند ایک مسلمان کے ہاتھ سے مارے گئے۔ اور اس کے کچھ عرصہ بعد مجوزہ دستور کے متعلق نہرو رپورٹ کی سفارشات نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ اور صاف نظر آنے لگا کہ برعظیم کی یہ دو ملتیں اب کبھی متحد نہیں ہو سکیں گی۔ انہی دنوں مولانا مودودی نے اپنی مشہور کتاب "الجہاد" لکھی۔ اور "ملک کی دوسری قوموں کے ساتھ مل کر آزادی کی جدوجہد" اور "ہندوستان کے مسلمانوں کے ملی استقرار اور انفرادیت" کے عملی اور پیش نہاد فوری مسائل کے بجائے نظری اسلام کی طرف ان کا رجحان بڑھا۔ چنانچہ ان کے اس زمانے کی ایک تحریر ملاحظہ ہو :-

"اسلام کے اس عقیدے کے مطابق حکومت کی اچھائی کا معیار نہ اس کا قومی اور خود اختیاری

[1] مودودی صاحب کے ایک رفیق کار ملک غلام علی لکھتے ہیں :- "...... جس زمانے میں مولانا کا ادارتی تعلق "الجمعیت" سے رہا ہے۔ اس زمانے میں جمعیت العلماء ہند کانگرس کے نظریات و عملیات کی ہم نوا نہیں تھی .... مولانا مودودی کی "الجمعیت" کی ادارت سے سبکدوشی کے دو سال بلکہ زیادہ مدت کے بعد جمعیت العلماء ہند نے اپنا مستقل تعلق کانگرس سے جوڑا تھا۔" (یہ آخری بات صحیح نہیں جمعیت العلماء ہند نے مئی سنہ ۱۹۳۰ء کو اپنے امروہہ کے سالانہ اجلاس میں کانگرس سے اپنا تعلق جوڑنے کی قرارداد منظور کر لی تھی۔ (مرتب))

ہوتا ہے۔ اور نہ اس کی بُرائی کا معیار اجنبی یا غیر خود اختیاری ہونا۔ اصل سوال یہ ہے کہ حکومت کا نظام عادلانہ اور حق پرستانہ ہے یا نہیں ......"

بے شک نظری اعتبار سے اس سوال میں کوئی بحث نہیں لیکن جس سیاق و سباق میں مولانا نے یہ سوال اٹھایا اس کو سامنے رکھ کر اگر سوچا جائے تو یہ سوال بڑا گمراہ کن تھا اس وقت ملک پر ایک اجنبی حکومت قابض تھی جس سے گلوخلاصی کرانے کے لئے ہندوستان میں آزادی کی جنگ جاری تھی۔ اور یہ جنگ اس سیاسی اصول پر لڑی جا رہی تھی کہ ہر قوم کو اپنے اوپر حکومت کرنے کا حق ہے۔ یہ حق خود اختیاری پہلی جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد کچھ تسلیم کیا جانے لگا تھا اور دوسری جنگ عظیم کے بعد اسی حق خود اختیاری کی بنا پر دنیا کی بیشتر غلام قوموں کو آزادی مل چکی ہے۔ بہرحال اس سیاق و سباق اور اس سیاسی پس منظر میں مولانا کا یہ کہنا کہ اسلام کے نزدیک حکومت کی اچھائی کا معیار قومی اور خود اختیاری ہونا نہیں ہے، ایک ایسا ذہنی مغالطہ تھا جس نے بعد میں خود مولانا کے فکر کو بالکل ایک نئے ڈھرے پہ ڈال دیا، اور وہ نہ صرف کل ہندوستان کی آزادی بلکہ ہندوستان کی مسلم اکثریت کے صوبوں کی آزادی کو بھی بیکار سمجھنے لگے۔ اور انہوں نے اس کی اہمیت کو کم کرنے بلکہ اسے کفر و شرک ثابت کرنے پر اپنا تمام زور قلم صرف کر دیا۔[1]

[1] ۱۲ر ستمبر ۱۹۴۳ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں طلباء کو مخاطب کرتے ہوئے مولانا نے کہا :-

"بعض لوگ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ، ایک دفعہ غیر اسلامی طرز ہی کا سہی مسلمانوں کا قومی سٹیٹ تو قائم ہو جائے۔ پھر رفتہ رفتہ تعلیم و تربیت اور اخلاقی (اگلے کالم پر)

(بقیہ کالم اول)

اصلاح کے ذریعے اس کو اسلامی سٹیٹ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے، مگر میں نے تاریخ، سیاسیات اور اجتماعیات کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے اس کی بنا پر میں اسکو ناممکن سمجھتا ہوں ......"

اس خطاب میں مولانا نے قومی اسٹیٹ اور اس میں جمہوری طرز حکومت کے نفاذ کی مخالفت کی اور کہا کہ اس طرح ان لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار آئے گا جو مردم شماری کے رجسٹر میں مسلمان ہوں گے۔ چنانچہ "اس قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار آنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اسی مقام پر کھڑے ہیں جس مقام پر غیر مسلم حکومت میں تھے، بلکہ اس سے بھی بدتر مقام پر، کیونکہ وہ "قومی حکومت" جس پر اسلام کا نمائشی لیبل لگا ہوگا اسلامی انقلاب کا راستہ روکنے میں اس سے بھی زیادہ جری و بیباک ہوگی جتنی غیر مسلم حکومت ہوتی ہے ....."

اس لئے مولانا کا فرمانا یہ تھا کہ :-

"اس نام نہاد "قومی حکومت" کے انتظار میں اپنا وقت یا اس کے قیام کی کوشش میں اپنی قوت ضائع کرنے کی حماقت آخر ہم کیوں کریں، جبکہ ہمیں یہ معلوم ہے کہ وہ ہمارے مقصد کے لئے نہ صرف غیر مفید ہوگی بلکہ کچھ زیادہ ہی سدِ راہ ہوگی ......"

(اقتباسات از اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے)

یعنی ماحصل مطلب یہ ہوا کہ "قومی حکومت" کیلئے جد و جہد کرنا اسلامی انقلاب کا راستہ روکنا ہے اسلئے انگریز جتنی سے حکومت کرے ہم اسکے زیر سایہ "اسلامی انقلاب" کی بنیادیں از سر نو تیار کریں خواہ اس پر [illegible]

ہمارے خیال میں ملک و قوم کے ٹھوس اور عملی مسائل کے بجائے مولانا مودودی کا اسلام کے اس قسم کے نظریاتی

تصورات کی طرف یہ رجحان حد اصل نتیجہ تھا اُس زمانہ کے ہندوستان کی شدید سیاسی ابتری سے مایوسی کا جو ملک میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے آپس کے آئے دن کے جھگڑوں اور خونریز فسادات نے پیدا کر دی تھی۔ ان دنوں اسی مایوسی کے بہت سے آدمی شکار ہوئے اور کانگریس سے تعلق رکھنے والے مسلمان سیاسی کارکن ان میں سب سے نمایاں تھے۔ پنجاب میں مجلس احرار اسلام کا قیام بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ مولانا محمد علی مرحوم اور ان کے ساتھی بھی انہی حالات سے بددل ہو کر کانگریس سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔

۱۹۲۸ء کے آخر میں مودودی صاحب حیدرآباد (دکن) تشریف لے گئے اور وہاں سے ۱۹۳۳ء میں انہوں نے اپنا ماہوار رسالہ "ترجمان القرآن" جاری کیا۔ جو ان کی موجودہ تحریک اسلامی کا پیش خیمہ بنا۔ اسی کے ذریعہ انہوں نے اپنی "دعوت" کے لئے زمین ہموار کی اور وہی بعد میں اساس بنا ان کی دینی اور سیاسی قیادت کا۔ یہ رسالہ گویا مولانا کی "الکتاب" ہے اور اس کی تحریروں کے شانِ نزول سے ان کی تمام فکری و عملی سرگرمیوں کو سلسلہ وار ترتیب دیا جا سکتا ہے۔

حیدرآباد دکن میں مودودی صاحب کے بڑے بھائی دارالترجمہ سے متعلق تھے۔ شاید انہی کی وساطت سے موصوف کو عربی میں فلسفہ کی ایک کتاب ترجمہ کو مل گئی۔ گو وہ شائع نہ ہو سکی[۵۸] لیکن اس کے معاوضہ میں مولانا کو جو ہزار روپے کی رقم ملی اسی سے انہوں نے "ترجمان القرآن" جاری کیا۔ نیز ریاست کا محکمہ امور مذہبی رسالہ "ترجمان القرآن" کے کئی سو پرچے خریدتا تھا۔ انہی دنوں مولانا کو حیدرآباد کے وزیراعظم سر اکبر حیدری کے مشورہ سے جامعہ عثمانیہ میں دینیات کی پروفیسری بھی پیش کی گئی۔[۵۹] اس کے علاوہ موصوف کے مضامین پڑھ کر ریاست کے بعض اونچے طبقے کے لوگ بھی ان سے متاثر ہوئے۔ چنانچہ وہ موٹر بھیج کر مولانا کو اپنے ہاں بلایا کرتے تھے۔[۶۰]

یہ تھا وہ ماحول اور یہ تھے وہ اسباب جن میں "ترجمان القرآن" نے اپنی زندگی کی ابتدا کی۔ اب جیسا کہ اوپر ذکر ہوا "الجمعیت" کی ایڈیٹری کے آخری زمانے میں مودودی صاحب ہندوستان کی سیاسی صورتِ حال سے سخت بددل تھے۔ چنانچہ اس کا ذکر کرتے ہوئے وہ اپنی "خود نوشت" ۱۹۳۲ء میں ایک جگہ لکھتے بھی ہیں :- "دس سال کے مسلسل تجربات نے مجھے ہندوستان اور خصوصاً اردو زبان کی اخبار نویسی سے بالکل بیزار کر دیا تھا۔ اور میرے لئے یہ زندگی سوہانِ روح ہوتی جا رہی تھی۔ آخر کار ۱۹۲۸ء کے خاتمے پر میں نے "الجمعیت" سے قطع تعلق کر لیا۔" اور جب مودودی صاحب نے ۱۹۳۳ء میں ترجمان القرآن نکالا تو ہندوستان کے سیاسی حالات اور بھی زیادہ خراب ہو گئے تھے۔ اور خاص طور سے مسلمانوں کے لئے۔ بات یہ ہے کہ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۲ء میں انگریزی حکومت کے خلاف کانگریس نے بہت بڑا جارحانہ اقدام کیا تھا جس سے اس کی ساکھ بہت بڑھ گئی تھی اور پھر انہی دنوں لندن کی گول میز کانفرنس میں ہندوستان کے لئے نئی اصلاحات بھی طے ہو رہی تھیں۔ اور سب کو معلوم تھا کہ ہندوستانیوں کو اختیاراتِ حکومت کی ایک اور قسط ملنے والی ہے۔ اور اس میں یقیناً کانگریس اور ہندو ہی فائدے میں رہیں گے۔

---

[۵۸] "مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں" پر صفحہ ۴۹ میں لکھا ہے "......اگر یہ کتاب شائع ہو جاتی تو......"

[۵۹] "مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں" صفحہ ۳۴۔

[۶۰] "ابوالاعلیٰ مودودی" صفحہ ۵۷

[۶۱] یہ صاحب نواب نثار جنگ بہادر تھے۔ "مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں" صفحہ ۳۴۵

اسکے برعکس یہی وہ سال ہیں جن میں برطانیہ کی لیبر پارٹی کا شیرازہ بکھر گیا اور اسکے لیڈر رمزے میکڈانلڈ کنزرویٹو پارٹی سے جا ملے اور انگریزوں کی یہ قدامت پسند پارٹی جو ہندوستان کو حقِ اختیارات حکومت دینے کی ہمیشہ سے مخالف رہی ہے برطانیہ میں پوری طرح برسرِ اقتدار آ گئی۔ ادھر ہندوستان میں لارڈ ولنگڈن جیسے متعصب شخص کو ۱۹۳۱ء میں وائسرائے بنا کر بھیج دیا گیا۔ ان حالات میں مسلمانوں کے بعض با اثر رہنما کس طرح سوچنے لگے تھے اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے۔

لندن میں دوسری گول میز کانفرنس منعقدہ ۱۹۳۱ء میں شرکت کے بعد مولانا شوکت علی مرحوم قاہرہ میں ٹھہرے۔ وہاں انہوں نے ایک موقع پر بڑے فخر سے بیان کیا کہ میں نے لارڈ ارون کو یقین دلا دیا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان سات کروڑ اچھوتوں اور والیانِ ریاست کیساتھ مل کر کانگرس سے نمٹ لیں گے۔

یہاں اس بات کا ذکر کر دینا ضروری ہے کہ قائدِ اعظم دوسری گول میز کانفرنس میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ نیز وہ ہندوستان کی اُس وقت کی سیاست سے اتنے دل برداشتہ تھے کہ وہ تقریباً ۱۹۳۵ء تک لندن ہی میں مقیم رہے۔

ہندوستان کے اس سیاسی پس منظر، ہندوستان کے مسلمانوں کے ان حالات اور حیدر آباد دکن کی "اسلامی ریاست" کے اس قسم کے ماحول میں "ترجمان القرآن" نکلنا شروع ہوا۔ ظاہر ہے، ایک ایسے مجلہ سے جو حیدر آباد دکن سے شائع ہو کافی پڑھے لکھے افراد اس کے مخاطب ہوں اور حیدر آباد دکن کا محکمہ امورِ مذہبی اس کے کئی سو پرچے خریدے۔ اسمیں ملک کی جدوجہدِ آزادی کا ذکر تو ہو نہیں سکتا اور نہ عوام کے سیاسی و معاشی حقوق پر لکھا جا سکتا تھا اور نہ اس میں شخصی حکومت اور مطلق العنانی پر تنقید ممکن تھی۔ اس زمانے میں زیادہ تر اسلامی تہذیب کے اعلیٰ تصورات، مغربی تہذیب کی برائیاں اور نیشنلزم کے مفاسد ہی مولانا کے موضوعِ بحث رہے اور حیدر آباد کی داخلی سیاست، دو ملکی و غیر ملکی سوال کی دیگر جن تفصیل سے بحث کی جا چکی ہے یہ موضوع وقت کے مطابق بھی تھے۔ چنانچہ مولانا نے نیشنلزم اور قومیت کے خلاف جی کھول کر لکھا۔ یہاں تک کہ اس جوش میں یہ بھی لکھ گئے۔

"معاشی اغراض کا اشتراک انسانی خود غرضی کا ایک ناجائز بچہ ہے" اور یہ کہ "نظامِ حکومت کے اشتراک سے مستحکم قومیت کی تعمیر ممکن نہیں"۔ مختصراً انہوں نے اس زمانے میں بار بار اس بات پر زور دیا کہ

"اسلام میں "وطنیت" کا کلی استیصال
ہو جاتا ہے"

اور

"جہاں نیشنلزم ہے وہاں اسلام کبھی پھل پھول
نہیں سکتا اور جہاں اسلام ہے وہاں نیشنلزم
کے لیے کوئی جگہ نہیں"

اس ضمن میں آپ نے ہندوستانی متحدہ قومیت پر بھی خوب لے دے کی اور بعد میں تحریکِ پاکستان کے سلسلے میں جب "مسلم قومیت" کا غلغلہ ہوا تو مولانا نے اس کو بھی اپنے زہریلے تیروں کا نشانہ بنایا اور یہاں تک لکھا کہ :-

"مسلم نیشنلزم بھی خدا کی شریعت میں اتنا ہی ملعون
ہے جیسا ہندوستانی نیشنلزم"

مولانا ۱۹۴۳ء تک اسی جوش و خروش میں لکھتے چلے گئے بلکہ جوں جوں دن گزرتے گئے ان میں شدت اور غلو زیادہ ہوتا گیا۔ (موصوف کی ان تحریروں کے اقتباسات پہلے اسی کتاب میں کافی دیے جا چکے ہیں) یہاں تک کہ یہ عظیم آزاد ہو گیا اور گو پورے ملک میں ایک متحدہ ہندوستانی قومیت تو بار نہ پا سکی لیکن جو حصۂ ملک ہندو اکثریت کو ملا وہاں ہندوستانی قومیت وجود میں آ گئی اور جو حصۂ ملک مسلمان اکثریت نے حاصل کیا وہاں پاکستانی اور مسلم قومیت بار آور ہوئی۔ الغرض مودودی صاحب کی ۱۹۳۲ء سے لیکر ۱۹۴۷ء تک کی تمام قلمی و لسانی جدوجہد کے باوجود جس چیز سے وہ مسلمانوں کو خدا اور رسول کے نام منع کرتے تھے وہی چیز مسلمانوں نے خدا اور رسول کے نام پر حاصل کر لی۔

البیان

قرآن مجید کا سلیس اردو ترجمہ مختصر اور مفید تفسیری حواشی کے ساتھ

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ۚ

ہر شخص کا نصب العین ہوتا ہے جس کے لئے وہ ہمہ تن کوشاں ہوتا ہے ۵۱ اے مسلمانو! تم جملہ نیکیوں کے پانے میں سبقت حاصل کرو ۔

أَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَأْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ۚ إِنَّ اللّٰهَ

تم جہاں بھی ہوگے اللہ تعالیٰ تم سب کو اکٹھا کر لائے گا ۵۲ تحقیق اللہ تعالیٰ

عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ

ہر ارادہ پر قادر ہے اے پیغمبر! تو جہاں سے بھی خروج کرے بہرحال تو اپنی پوری توجہ

۵۱ اللہ تعالیٰ نے یہ عام قانون بیان فرمایا ہے کہ کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ انسان کا مقصد معین ہو اور پھر انسان اس مقصد کے لئے ہمہ تن کوشش بن جائے ۔ ہر وقت اسی کا فکر رکھے۔ اس کے بغیر کامیابی نصیب نہیں ہوتی۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کا نصب العین متعین فرما دیا ہے اور انہیں توجہ دلا دی ہے کہ نیکیوں اور اعلیٰ مقاصد کے حصول میں تم ایک دوسرے سے سبقت لیجانے میں مصروف رہو۔ گویا صرف نیک بن جانا مومن کا منتہائے مقصود نہیں ہے بلکہ دوسرے تمام نیک لوگوں سے بھی بڑھنے کی کوشش کرنا اس کا مدعا ہے ۔

الخیرات کا لفظ بہت وسیع ہے ۔ **دین** کی ہر قسم کی بھلائی پر بھی مشتمل ہے اور دنیا کی ہر قسم کی ترقی پر بھی حاوی ہے مسلمان کا مقصد یہ ہے کہ اخلاقی اور دینی طور پر بھی اعلیٰ مقام کو حاصل کرے اور دنیوی طور پر بھی ترقی یافتہ ہو ۔

۵۲ یہ آیات مسلمانوں کی مکہ سے ہجرت کے بعد اور المسجد الحرام کو مستقل قبلہ مقرر کئے جانے پر نازل ہوئی ہیں ۔ اس جگہ یہ وعدہ فرمایا ہے ۔ کہ اللہ تعالیٰ آخر کار مسلمانوں کو مکہ میں لائے گا اور مسلمانوں کی پراگندگی اور انتشار کو دور فرمائیگا چنانچہ فتح مکہ کے ظہور پر یہ وعدہ پورا ہو گیا ۔

شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَإِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَمَا

المسجد الحرام کی جانب رکھ ۔ یہ بات تیرے رب کی طرف سے پختہ اور اٹل ہے ۔ یاد رکھو کہ

اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ○ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ

تمہارے کاموں سے غافل رہنا اللہ تعالیٰ کے شایان شان نہیں ۔ اے نبی! تو جس وقت بھی نکلے تو ہر حالت میں اپنا رُخ

وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا

مسجد الحرام کی طرف رکھنا ۔ اے مسلمانو! تم جہاں بھی ہو اپنے

ف۳ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شارع نبی ہیں ۔ آپ اپنی اُمت کے لئے تمام اعمال میں نمونہ ہیں ۔ المسجد الحرام کی طرف نمازوں میں مُنہ کرنے کے حکم میں سب سے پہلے آنحضرت کو مامور کیا گیا ۔ اور فرمایا گیا کہ آپ ہر جگہ اور ہر گھڑی اسی خانۂ خدا کی طرف توجہ رکھیں ۔ یہ حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دو مرتبہ دیا گیا ہے ۔ کیونکہ مکہ مسلمانوں کا روحانی مرکز ہے ۔ اور پھر اس کی فتح کا وعدہ بھی دیا گیا تھا ۔ ایک مرتبہ تو نمازوں میں مُنہ کرنے کا حکم روحانی حالت کی اصلاح کے لئے دیا گیا ۔ اور دوسری مرتبہ اس کی تسخیر کے وعدہ کے لئے کوشش اور توجہ کرنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے ۔

حَیْثُ کا لفظ عربی زبان میں عام طور پر مکان کے لئے آتا ہے ۔ مگر کبھی زمان کے لئے بھی مستعمل ہو جاتا ہے ۔ اسلئے دو حکم مکان اور زمان کے اختلاف کی وجہ سے دیئے گئے ۔ گویا فرمایا کہ ہر جگہ اور ہر وقت آپ کی روحانی اور معنوی توجہ اسی اُمّ القریٰ اور اس کی روحانی برکات کی طرف رہنی چاہیئے ۔ اِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ کہہ کر یقین دلایا کہ المسجد الحرام کا دائمی قبلہ مقرر ہونا اللہ تعالےٰ کا اٹل فیصلہ ہے ۔ نیز آپ کے ہاتھوں مکہ کا فتح ہونا اللہ تعالیٰ کی ناقابلِ تبدیل تقدیر ہے ۔

وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ ۙ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ۙ إِلَّا الَّذِينَ

مونہوں کو المسجد الحرام کی طرف رکھو ۵۴ تاکہ عام لوگ تم پر کوئی اعتراض نہ کر سکیں بجز ان کے جو

ظَلَمُوا مِنْهُمْ ۙ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي ۙ وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي

ان میں سے ظالم ہیں ۵۵ سو اُن سے مت ڈرو میری ہی خشیت اختیار کرو۔ نیز تاکہ میں تم پر اپنی نعمت کو

عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ۙ كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا

تمام کروں اور تم ہدایت یافتہ بن جاؤ۔ جیسے ہم نے تم میں سے ہی تمہارے لئے کامل رسول بھیجا ہے ۵۶

۵۴ حکم کی تاکید کے لئے اُمّت کے جملہ افراد کو بھی اس طرح مخاطب کیا گیا۔ کہ تم بھی ہر جگہ قبلہ کی طرف مُنہ کیا کرو۔ نمازوں میں ایسا کرنا اُمّت کی یکجہتی کی بنیاد ہے۔

۵۵ مکہ کے لوگ کہتے تھے۔ کہ اگر یہ نبی خدا کی طرف سے ہوتا تو مکہ ایسی بستی سے کیوں نکالا جاتا۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ ہم فتح مکہ کے ذریعہ سے اس اعتراض کو بھی دُور کر دیں گے۔ ہاں جو ظالم ہیں وہ فضول باتیں کرتے رہینگے ورنہ فتح کے بعد منکرین کے لئے کوئی مقامِ اعتراض باقی نہ رہے گا۔ نیز اس طرح المسجد الحرام کے دائمی قبلہ مقرر ہونے سے اور بھی بہت سے فائدے حاصل ہوں گے۔ اور مسلمانوں کو روحانی ترقیات ملیں گی۔

۵۶ یعنی جس طرح ہم نے اس عظیم الشان رسول کو بھیج کر تم پر احسان کیا ہے ویسا ہی کعبہ کو دائمی قبلہ مقرر کر دینا مسلمانوں پر احسان عظیم ہے۔ اتحادِ قبلہ اُمّت کی وحدت کا دائمی نشان ہے۔

اس آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے پانچ مقاصد بیان ہوئے ہیں۔ (۱) آیات و احکام خداوندی پہنچانا۔ (۲) تزکیۂ نفوس۔ (۳) کتابِ الہٰی کی تعلیم۔ (۴) حکمت سکھانا۔ (۵) نئے نئے علوم سکھانا۔

درحقیقت ہر نبی کے آنے کے یہی مقاصد ہوتے ہیں۔ نئی شریعت تو صرف اس وقت آتی ہے جبکہ پہلی شریعت حالاتِ زمانہ یا اپنی تحریف کے باعث کافی نہ ہو۔ ورنہ ہر نبی نئی شریعت نہیں لاتا۔ جب تک یہ مقاصد باقی ہیں نبوت کی ضرورت باقی ہے۔

يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ سے ظاہر ہے۔ کہ قرآن مجید کی موجودگی میں بھی نبی کی ضرورت ہے۔

مِنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ

جو تمہیں میرے احکام و بیّنات سناتا ہے تمہیں پاک کرتا ہے اور تمہیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے

وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۞ فَاذْكُرُوْنِيْٓ

اور اور ہزاروں علوم جنہیں تم نہ جانتے تھے وہ تمہیں سکھاتا ہے ٹہ پس تم مجھے (اور میری نعمتوں کو)

اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ۞ ع ۱۸ ۵ ۲

یاد کرتے رہو میں تم کو یاد رکھوں گا۔ تم میرے احسانوں کا شکریہ ادا کرتے رہو اور میرے احسانوں کی ناقدری نہ کرو شہ

ٹہ جملہ مَا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ اپنے اندر ہر قسم کی عمومیت رکھتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عربوں کو اور اپنی اُمّت کو ہر قسم کے دینی و دُنیوی امور سکھلائے ہیں۔ اور انہیں دُنیا کی بہترین اُمّت بنا دیا۔ بھیڑوں اور اونٹوں کے چرواہے۔ اس **نبیٔ اُمّی** صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت سے ہی دُنیا جہان کے استاد و رہنما بن گئے۔

شہ شکر سے احسان بڑھتا ہے اور نعمتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ مسلمانوں کو یہ سبق دیا گیا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے فضلوں کو اس طرح زیادہ سے زیادہ جذب کر سکو گے۔ اللہ تعالیٰ کا ذکر اس کی ذات و صفات پر غور، اس کے فضل و احسان کی قدردانی دلی، عملی اور لسانی طور پر ہوتی ہے۔ ایسے بندے کو اللہ تعالیٰ اپنا قرب عطا فرماتا ہے اور اسے خاص عزت دیتا ہے۔ نعم المولیٰ و نعم النصیر۔

سیرِ سوات

(از مکرم جناب خورشید احمد صاحب شاد پروفیسر جامعۃ المبشرین)

ریاست سوات ایک سرسبز و شاداب علاقہ ہے جو نوّے میل لمبا اور پچاس میل چوڑا ہے۔ رقبہ ساڑھے ہزار مربع میل اور آبادی ساڑھے پانچ لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔ یہاں جناب سید عبدالودود بادشاہ صاحب نے باقاعدہ حکومت کی بنیاد ڈالی۔ آپ نے اس محنت اور عرق ریزی سے کام کیا کہ آج ہر شخص ریاست کے چپہ چپہ میں پورے امن و اطمینان سے چل پھر سکتا ہے۔ اب آپ کے بیٹے اور موجودہ والی جناب جہانزیب صاحب کی زیر نگرانی ریاست ہر پہلو سے ترقی کر رہی ہے۔ سیب، اخروٹ، خوبانی، ناشپاتی بکثرت پائے جاتے ہیں۔ شہد بھی یہاں کی بڑی پیداوار ہے۔ ریاست سوات کی سیاحت کے شائقین کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ سوات کی سیر کے لئے آخر جولائی سے لیکر اگست تک بہترین موزون وقت ہے۔ ان دنوں وادی کا حسن اپنے جوبن پر ہوتا ہے اور پھل بکثرت ملنے لگتے ہیں۔

جامعۃ المبشرین (مشنری کالج) ربوہ کی ایک ہائیکنگ پارٹی جو تین اساتذہ محترم مولانا ابوالعطاء صاحب پرنسپل جامعۃ المبشرین۔ مولوی غلام باری صاحب سیف وخاکسار خورشید احمد شاد پروفیسران جامعۃ المبشرین ربوہ و پانچ طلبہ مرزا لطف الرحمٰن صاحب سیکرٹری، محمود احمد صاحب مختار، عبدالرشید صاحب، ابن اللہ خان صاحب سالک، محمد نواز صاحب پر مشتمل تھی، ۱۸؍جون کی صبح کو راولپنڈی سے بذریعہ پنجاب ایکسپریس عازم سوات ہوئی۔ نوشہرہ میں پنجاب ایکسپریس چھوڑی وہاں سے مردان جانے کے لئے جی ٹی بس میں سوار ہوئے۔ مردان یہاں سے تیرہ میل کے فاصلہ پر ہے۔ مردان جاتے ہوئے نوشہرہ سے باہر نکلتے ہی دریائے کابل عبور کیا جاتا ہے۔ تھوڑی دور دائیں جانب سنگِ مرمر سُرخ کی کانیں ہیں جہاں سے ریسنگِ مرمر دُور دُور تک بھیجا جاتا ہے۔ اور پھر رسالپور چھاؤنی کے پاس سے گزرتے ہیں۔ سڑک کے دائیں طرف مردان سے قریباً دو میل پہلے ایشیا بھر میں سب سے بڑی شوگر مل "پریمیئر شوگر مل" آتی ہے۔ ہماری بس نے تیرہ میل کا فاصلہ قریباً چالیس منٹ میں طے کیا اور ہم دس بجے بخیریت مردان پہنچ گئے۔ وہاں ۱۹؍جون کی صبح تک مسجد احمدیہ میں قیام کیا۔ مسجد احمدیہ مردان میں مردوں اور عورتوں کے لئے علیحدہ علیحدہ مہمانخانے ہیں۔ مہمان نوازی کا بھی اچھا انتظام ہے۔ مسجد میں اور مہمانخانوں میں بجلی کے پنکھے لگے ہوئے ہیں۔ ایک کنواں بھی ہے جس کا پانی بہت ٹھنڈا ہے۔ دوپہر بآرام گزاری جا سکتی ہے۔

۱۹؍جون کی صبح ۷½ بجے ہمارا قافلہ پاکستان سوات میل بس سروس کے ذریعہ ریاست سوات کے دارالخلافہ سیدو شریف منگورہ کی طرف روانہ ہوا۔ تیس میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہماری بس ۹ بجے درگئی پہنچی۔ جہاں پولیس پوسٹ نے

بس کے تمام مسافروں کے نام اور پتے نوٹ کئے اور ملاکنڈ ایجنسی سے اجازت نامہ کے لئے ہمیں ۲½ گھنٹہ درگئی میں انتظار کرنا پڑا۔ اتنی دیر غالباً خان عبدالغفار خان کی گرفتاری کی وجہ سے ہوئی ورنہ عام حالات میں وہاں پندرہ بیس منٹ انتظار کرنا پڑتا ہے۔

مردان سے درگئی تک ہماری بس سرسبز و شاداب وادی سے گزری۔ مکئی۔ جوار کی بکثرت کاشت کی گئی تھی راستہ میں دو مشہور قصبات گوجر گڑھی اور تخت بھائی آتے ہیں۔ تخت بھائی میں ایک شوگر مل بھی ہے اور یہیں سے ایک سڑک کوہ کراکڑ اور پیر بابا ہوتی ہوئی ریاست سوات کو جاتی ہے جو بریکوٹ کے مقام پر ملاکنڈ منگورا روڈ سے آملتی ہے۔

درگئی میں بس میں بیٹھے بیٹھے داہنی جانب پہاڑ کے دامن میں ہم نے درگئی ہائیڈرو الیکٹرک ورکس بھی دیکھا جس کے لئے جبین کے مقام سے ایک چھوٹی سی نہر پہاڑ کے ساتھ ساتھ لائی گئی ہے۔ اور درگئی کے مقام پر یہ نہر پانچ پائپوں میں بٹ کر پانچ آبشاریں بناتی ہے۔

ملاکنڈ ایجنسی سے اجازت ملنے پر ۱۱ بجے ہماری بس ملاکنڈ کی طرف روانہ ہوئی جو درگئی سے چھ میل کے فاصلہ پر ہے۔ یہ چھ میل خطرناک پہاڑی چڑھائی ہے۔ کثرت سے تنگ موڑ آتے ہیں۔ کئی جگہ خطرہ سے آگاہ کرنے کے لئے بورڈ لگے ہوئے ہیں۔ جن پر لکھا ہے:۔

"سڑک پر تنگ موڑ ہیں۔ سامنے سڑک نظر نہیں آتی۔ بائیں چلیں"

ملاکنڈ ایجنسی بالکل نیچے پہاڑ کے عین دامن میں سڑک کے نیچے دائیں طرف جبین کے مقام پر مشہور ہائیڈرو الیکٹرک پاور اسٹیشن ہے۔ یہاں سے اور درگئی سے تمام سرحد اور ملحقہ ریاستوں کو بجلی مہیا کی گئی ہے۔ بلکہ اب یہ بجلی سابق پنجاب کے علاقوں میں آپہنچی ہے۔ جبین کے مقام پر بجلی پیدا کرنے کے لئے بٹ خیلہ کے قریب امان درا ہیڈ ورکس سے ایک نہر نکالی گئی ہے جو پانچ چھ میل پہاڑی سرنگ میں سے گزر کر جبین میں بہت بڑی آبشار بنا کر گرتی ہے اور پھر یہی نہر وادی مردان کو سیراب کرتی ہے۔

ملاکنڈ ایجنسی کے دفاتر جس پہاڑ پر واقع ہیں وہ قریباً تین ہزار فٹ بلند ہے۔ اس جگہ زیتون کے درخت بکثرت پائے جاتے ہیں۔

ملاکنڈ سے گزر کر ہم بٹ خیلہ پہنچے۔ یہاں اچھا خاصہ بازار ہے۔ کپڑے اور کریانہ کی بڑی بڑی دوکانیں ہیں۔ تجارتی منڈی معلوم ہوتی ہے۔ کھانا کھانے کے لئے اچھے ہوٹل بھی ہیں۔ یہاں ہماری پارٹی نے کھانا کھایا۔ یہ قصبہ ملاکنڈ ایجنسی کے ماتحت واقع ہے۔ اور یہیں سے ہماری بس اس وادی میں داخل ہوئی۔ جو دریائے سوات کی وجہ سے وادی سوات کہلاتی ہے۔ یہاں دائیں اور بائیں بلند پہاڑ دور دور واقع ہیں۔ وسیع وادی ہے۔ دریائے سوات کبھی عین درمیان میں اور کبھی دائیں جانب اور کبھی بائیں جانب بہتا ہے۔

بٹ خیلہ سے قریباً چھ میل دور چکدرہ آتا ہے۔ یہاں سے ایک سڑک ریاست دیر اور چترال کو جاتی ہے دریا کو عبور کرنے کے لئے پختہ پل بنا ہوا ہے۔ ریاست دیر یہاں سے ۴۷ میل اور چترال ۱۲۷ میل ہے۔ دیر تک تو

دن میں باقاعدہ سروس جاری ہے۔ لیکن چترال پہنچنے کیلئے جیپ کا سفر اختیار کرنا پڑتا ہے۔ لیکن ہمیں وہاں کے لوگوں سے معلوم ہوا کہ دیر اور چترال کا سفر پولیس گارد کے بغیر خطرہ سے خالی نہیں۔ ان ریاستوں میں مسافروں کے لئے وہ امن و امان نہیں جو ریاست سوات میں پایا جاتا ہے۔ چکدرہ سے نکلے تو دُور سے ایک اونچے ٹیلہ کے دامن میں ایک بڑا گاؤں نظر پڑا جس کے مکانات اُوپر نیچے بڑا عجیب نظارہ پیش کر رہے تھے۔ یہ "تھانہ" تھا۔ یہ بھی مالاکنڈ ایجنسی کے ماتحت ہے۔ اس میں بھی اچھا خاصہ بازار ہے۔ نانبائی، خوبانی اور دوسرے پھلوں کے باغات یہاں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ "تھانہ" سے کچھ آگے "غلوکنڈا" مقام سے ریاست سوات کا علاقہ شروع ہوتا ہے بس کے ڈرائیور نے ہمیں بتایا کہ غلوکنڈا کے معنی "چوروں کا مسکن" ہیں۔ ریاست کی باقاعدہ حکومت قائم ہونے سے پہلے یہ جگہ ڈاکوؤں اور چوروں کی کمین گاہ تھی۔

"غلوکنڈا" سے دریا بالکل ہماری سڑک کے نیچے بہتا تھا۔ یہاں ہم نے دیکھا کہ لوگ چمڑے کی مشک میں ہوا بھر کر اپنے سینے کے نیچے دبا کر دریا عبور کرتے ہیں۔ دریا کو عبور کرنے کا دوسرا ذریعہ ایک کشتی ہے جو انہیں مشکیزوں میں ہوا بھر کر آٹھ دس مشکیزوں کو بانسوں سے اکٹھا باندھ کر بنائی جاتی ہے۔ پندرہ بیس سواریاں اس کشتی کے ذریعہ ایک وقت میں دریا عبور کر لیتی ہیں۔ ملاح اس کشتی کو باقاعدہ چپوؤں کے ذریعہ چلاتا ہے۔ قریباً تین میل چل کر ریاست کی چیک پوسٹ آئی جہاں بس کے مسافروں کے سامان کی تلاشی لی گئی۔

"غلوکنڈا" تک سڑک عمدہ تارکول کی بنی ہوئی ہے اس سے آگے سڑک پختہ تو ہے لیکن تارکول نہیں بچھایا گیا۔ جب ہم سیدو شریف کے قریب پہنچے تو اس سڑک پر تارکول بچھائی جا رہی تھی۔ امید ہے کہ ساری سڑک پر جلدی تارکول بچھا دی جائے گی۔ دو بجے ہماری بس منگورا پہنچی۔

مردان سے منگورا ستر میل ہے۔ یہ سارا راستہ ہی پُرلطف ہے۔ پہلے مردان کی سرسبز و شاداب وادی۔ پھر درگئی اور مالاکنڈ کے پاور سٹیشن اور دونوں نہریں عجیب نظارہ پیش کرتی ہیں۔ پھر وادیٔ سوات نہایت ہی سرسبز و شاداب خطہ ہے۔ تمام زمین کو دریائے سوات سیراب کرتا ہے۔ اگر دائیں بائیں جنگلات سے ڈھکے ہوئے پہاڑ ہیں تو آگے پیچھے باغوں اور سرسبز و شاداب کھیتوں سے لہلہاتی وادی ہے جس میں دریائے سوات کے پانی کی آبشاریں اور ٹھٹھلتی لہریں عجیب سماں پیدا کرتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ سوات دراصل سواد تھا جس کے معنی سیاہی کے ہیں یعنی سرسبزی و شادابی کی وجہ سے اس ریاست کی زمین سیاہ دکھائی دیتی ہے۔

منگورا

منگورا میں ہم نشاط ہوٹل میں ٹھہرے۔ دو کمرے کرایہ پر لے لئے گئے۔ ہوٹل کی بلڈنگ خوبصورت ہے۔ خدمت بھی اچھی ہے۔ لیکن مالک جس نے یہ عمارت سالانہ کرایہ پر لی ہے سرمایہ کی کمی کی وجہ سے مہمانوں کی خوراک کا انتظام بخوبی نہیں کر سکتا اس لئے کھانے اور ناشتے کا انتظام ہم خود کرتے رہے۔ ویسے بھی ٹریفنگ کے لحاظ سے ناشتہ اور کھانا خود تیار کرنا ہمارے پروگرام میں شامل تھا۔ نہا دھو کر اور نمازوں سے فارغ ہو کر ناشتہ کر چکے

بعدہم منگورا اور سیدو شریف کی سیر کے لئے نکلے آئیے اب ہم آپ کو منگورا کی سیر کراتے ہیں۔

منگورا ریاست کا سب سے بڑا شہر ہے۔ تین چار خوبصورت بازار ہیں جہاں تمام ضروریاتِ زندگی مہیا ہوسکتی ہیں۔ کئی ایک اچھے ہوٹل ہیں۔ جن میں نشاط ہوٹل اور سٹار ہوٹل زیادہ اچھے ہیں۔ اشیاء خوردنی دودھ، انڈہ، مرغ، روٹی سستی مل جاتی ہے۔ دودھ ۵ ر سے ۶ ر سیر تک۔ انڈہ ۹ ر سے ۱۲ ر درجن، مرغ ۱۲ ر سے ۱۴ ر تک مل جاتا ہے۔ شہد یہاں بکثرت ملتا ہے۔ کئی ایک بیوپاری خالصۃً شہد کا کاروبار کرتے ہیں اور ریاست سے باہر بھی بھجواتے ہیں۔ گھی بھی بکثرت ملتا ہے لیکن ہماری سیر کے دنوں میں بارش نہ ہونے کی وجہ سے کچھ مہنگا ہی تھا یعنی ۵ روپیہ سیر لیکن ریاست کا سیر ہمارے سوا سیر کے برابر ہے۔

ریاست میں آنے جانے کے لئے تمام سروسوں کے اڈے اسی جگہ ہیں۔ یہیں سے دوسری جگہوں کو جانے کیلئے بسیں ملتی ہیں۔ ایک سڑک مدین اور بحرین کو جاتی ہے جو ۶۳ میل لمبی ہے۔ ایک سڑک مرغزار کو جاتی ہے جو ۹ میل لمبی ہے۔ اسی سڑک پر سیدو شریف واقع ہے۔

سیدو شریف

سیدو شریف یہاں سے مغرب کی جانب قریباً دو میل ایک بلند پہاڑ کے دامن میں واقع ہے یہی ریاست کا دارالخلافہ ہے۔ اور اسی جگہ ریاست کے تمام دفاتر واقع ہیں منگورا سے سیدو شریف تک اگر آپ پیدل جانا چاہیں تو پیدل چلے جائیں بہت پُرلطف راستہ ہے۔ دو رویہ باغات ہیں اور خوبصورت عمارات۔ اور اگر پیدل نہیں جاسکتے تو تانگہ لے لیں۔ ۲ ر فی سواری یا ۱۰ ر سالم تانگہ کے خرچ کرکے آپ سیدو شریف کے بازار میں پہنچ جائیں گے۔ راستہ میں دائیں جانب وٹرنری ہسپتال اور سٹار ہوٹل کی شاندار عمارات ہیں۔ پھر کالج کی شاندار خوبصورت تین منزلہ عمارت ہے۔ یہ کالج ۱۹۵۲ء میں مکمل ہوا۔ اس کے بعد سول ہسپتال ہے۔ بائیں طرف آپ ریاست کا مشہور ہوٹل "سوات ہوٹل" دیکھیں گے۔ جس میں رہائش اور کھانے کا اعلیٰ انتظام ہوتا ہے۔ ۱۵، ۱۶ روپیہ یومیہ فی کس چارج ہیں۔ اسی طرف کالج ہوسٹل کی خوبصورت عمارت ہے۔ اس کے قریب دارالعلوم حقانیہ کی عمارت ہے۔ جس میں دینی تعلیم دی جاتی ہے۔ ان عمارتوں اور کھیل کے میدانوں کے پاس سے گزرتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہم پاکستان کے کسی بڑے شہر کے کسی بارونق اور صاف ستھرے علاقہ میں سے گزر رہے ہیں۔ ذرا آگے چل کر سڑک دو حصوں میں تقسیم ہوجاتی ہے۔ ایک بازار سے ہوتی ہوئی ریاست کے دفاتر اور والی اور ولی عہد کے محلات کے پاس سے ہوتی ہوئی مرغزار چلی جاتی ہے اور دوسری بادشاہ صاحب کے محل کی طرف چلی جاتی ہے۔ بادشاہ صاحب کے محل کے پاس سے ایک سڑک دربار ہال اور میگزین کے نیچے سے اور والی صاحب اور ولی عہد صاحب کے محلات کے اوپر سے ہوتی ہوئی مرغزار روڈ میں آملتی ہے۔ اس سڑک پر سے تمام سیدو شریف اور منگورا کی ایک نظر سیر کی جاسکتی ہے۔ سب سے زیادہ پُرلطف اور دلفریب نظارہ وہ سرسبز وشاداب چناروں کا جھنڈ پیش کرتا ہے جو مرغزار روڈ پر والی صاحب اور ولی عہد صاحب کے محلات اور ریاست

کے دفاتر کے درمیان دفاتر کے صحن میں کھڑا ہے۔ اس جھنڈے پر ایک نظر ڈالنے سے تمام کوفت دور ہو جاتی ہے۔ اور تھکی ماندہ طبیعت میں نئے سرے سے تازگی پیدا ہو جاتی ہے۔ سیدو شریف کے عین وسط میں ایک خوبصورت مسجد ہے جس کے صحن میں سیدو بابا کا مزار ہے۔

ریاست کے دفاتر، مرکزی ادارون محلات اور سرکاری افسروں کے مکانوں کے علاوہ باقی مکانات وہی پرانی پہاڑی طرز کے ہیں۔

سیر کے دوران میں ہم نے یہاں زیب کالج کے طلبہ کو سفید قمیص اور شلوار میں دیکھا۔ کسی ایک نے بھی سوٹ نہ پہنا ہوا تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ کالج کے طلبہ کا یہی یونیفارم ہے۔ اس لباس میں طلبہ کیا بھلے معلوم ہو رہے تھے۔ کالج کی یہ یونیفارم مقرر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کالج کے منتظمین مغربیت سے متنفر اور اسلامی طرز بود و باش کی اہمیت کو سمجھتے ہیں۔ فی الحقیقت اس طرح انہوں نے ریاست کے بچوں کو بہت بڑی تباہی سے بچایا ہے۔ کاش پاکستان کے دوسرے کالج بھی قوم کے بچوں کو مغربیت کی اندھی تقلید سے بچانے کے لئے ایسے اقدامات کرکے جہاں ان کے دین کو مضبوط کرنے میں مدد ہوں وہاں ان کے والدین کو بھی گرانبار اخراجات سے نجات دلا دیں۔ اس قسم کا لباس ایسے کالج کے طلبہ کے لئے مقرر کیا جانا نہایت ضروری ہے جو ٹھوس دینی اقدار و اخلاق پیدا کرنے کے دعویدار ہیں۔

اس ریاست میں باقاعدہ حکومت قائم کرنے کا سہرا جناب سید عبدالودود صاحب المشہور بہ بادشاہ صاحب کے سر ہے۔ جو موجودہ والی صاحب کے والد بزرگوار اور ولیعہد صاحب کے دادا ہیں۔ آپ اس وقت ضعیف العمر ہیں اور ۱۹۴۹ء میں اپنے بیٹے جہانزیب صاحب موجودہ والی کو کاروبار حکومت سونپ کر گوشہ نشینی اختیار کر چکے ہیں۔ آپ گرمیوں کے دنوں میں دن کا وقت سیدو شریف میں ملاقات و مطالعہ میں گزارتے ہیں اور رات مرغزار گزارتے ہیں جہاں ان کا اکثر وقت عبادت میں گزرتا ہے۔ ان کی عبادت و ریاضت اور پیری میں بھی حصول علم کا شوق اور اہل علم کی قدر دانی کا شہرہ سنا تھا۔ اس لئے ہمیں ان سے ملاقات کی شدید خواہش تھی۔ سو الحمد للہ کہ ہمیں ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ جس وقت ہم ان سے ملے ہم نے انہیں باوقار اور وجیہ صورت بزرگ پایا۔ آپ مشکوٰۃ کا اردو ترجمہ مطالعہ کر رہے تھے ہمیں بڑے تپاک سے ملے۔ دریافت حال و احوال کے بعد ہم نے ریاست کے اندر امن و امان قائم کرنے اور اسلامی طرز حکومت کو تمام ریاست میں اپنانے کی کوششوں کو سراہتے ہوئے انہیں مبارکباد دی۔ آپ نے ہنس کر فرمایا کہ ریاست سوات کے متعلق مشہور تھا کہ یہاں کی ہر چیز بے راہ ہے سوائے پانی کے کہ وہ راہ پر چلتا ہے۔ چنانچہ میں نے ان تمام چیزوں کو راہ پر لانے کے لئے بڑی مشقت اور جانفشانی سے کام لیا۔ بعض دفعہ کئی کئی دن مجھے گھوڑے پر سفر کرنا پڑا۔ اور کئی جگہ جہاں دلدل کی وجہ سے گھوڑا نہ جا سکتا تھا میں وہاں پیدل گیا۔ اور امن و امان قائم کرنے کی کوشش کی۔ پیری میں بھی حصول علم کے ذکر پر فرمایا۔ کہ میں نے بچپن میں کوئی خاص تعلیم حاصل

نہیں کی تھی ۶۳ سال کی عمر کے بعد میں نے دینی علوم سیکھنے شروع کئے۔ صرف و نحو پڑھی۔ جلالین ختم کی۔ اور اب مشکوٰۃ پڑھ رہا ہوں۔

محترم مولانا ابوالعطاء صاحب نے دورانِ گفتگو میں فرمایا کہ ریاست سے کوئی اخبار یا رسالہ شائع نہیں ہو رہا؟ اس پر فرمانے لگے کہ لاہور یا راولپنڈی سے شائع ہونیوالے تو قریباً تمام اخبار اور رسالے یہاں آتے ہیں وہ انتظام بھی آہستہ آہستہ ہو جائے گا۔

ہمیں ریاست کے موجودہ والی صاحب سے ملاقات کی بھی بہت خواہش تھی لیکن افسوس ہے کہ ہماری یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ کیونکہ آپ ان دنوں یورپ و امریکہ کی سیاحت کے لئے تشریف لے گئے تھے۔ بہرحال موجودہ والی صاحب کی انتظامی و سیاسی صلاحیتوں کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ دورانِ سفر میں جب کبھی ہم نے چوری یا کسی چیز کے ضیاع کا خدشہ کا اظہار کیا تو ہمیں یہ کہا گیا کہ آپ بے فکر رہیں یہاں والی صاحب کی حکومت ہے۔ یہاں اگر آپ ہاتھ میں سونا لیکر بھی سفر کریں تو کسی کو آپ کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہ ہوگی۔

سو ہم اس امر کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ہمیں اپنے سارے سفر میں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔ ہم نے کسی جگہ بھی اجنبیت محسوس نہیں کی ہر جگہ ہی لوگوں کے سلوک سے ہمیں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہم اپنے گھر میں ہیں۔

بادشاہ صاحب کی کوٹھی کے قریب ہی سڑک کے کنارے ایک عمارت بن رہی تھی اس کے متعلق ہمارے رہبر نے بتایا کہ یہ بادشاہ صاحب اپنا مزار بنا رہے ہیں۔

۲۰ جون کی صبح کو ہم ایک بس سالم کرایہ پر لیکر مرغزار کی سیر کے لئے گئے۔ یہ جگہ کوئی ساڑھے پانچ ہزار فٹ بلند ہے۔ اور بہت بلند اور نہایت سرسبز و شاداب پہاڑوں کے سنگھم میں واقع ہے۔ یہاں صرف بادشاہ صاحب کا "سفید محل" ہے جو خالصتہً سنگِ مرمر کا بنا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ریاست کے معزز مہمانوں کے لئے مہمان خانہ بھی ہے اور ملازمین کی رہائش کے لئے کوارٹرز بھی بنائے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ اس جگہ کسی اور کو رہائش کی اجازت نہیں۔ بادشاہ صاحب یہاں رات کا وقت خلوت و عبادت میں گزارتے ہیں۔ محل کے سامنے صحن میں سنگِ مرمر کے میز اور ان کے ارد گرد سنگِ مرمر کے بنچ نصب ہیں مختلف قسم کے پھول اگے ہوئے ہیں جو اس محل کے حسن کو دوبالا کر دیتے ہیں۔ محل سے نیچے ٹیلیفون آفس کے پاس سڑک کے قریب ایک چشمہ ہے جس کا پانی بہت ٹھنڈا اور صحت کے لئے بہت مفید ہے۔ ہمیں یہ بتایا گیا کہ معائنہ کے بعد اس چشمہ کا پانی صحت کے لئے بہت مفید پایا گیا ہے بادشاہ صاحب یہی پانی پیتے ہیں۔ ہم نے اس چشمہ کے پاس چنار کے درختوں کے نیچے کھانا کھایا اور چائے پی۔ پھر ایک بجے واپس منگورا سیدھی بحرین جانے والی بسوں کے اڈہ پر پہنچے۔ منگورا سے بحرین ۲۶ میل ہے۔ اور کرایہ -/۱۲/۱ فی کس۔ ہم ٹکٹ لیکر بس میں بیٹھ گئے۔ بس بالکل چھوٹی سی تھی۔ ۲½ بجے روانگی کا وقت تھا لیکن چار بجے روانہ ہوئی سیٹیں بہت تنگ اور پھر مسافر اس طرح بھرے گئے جس طرح غلہ کی بوریاں اوپر نیچے لاد دی جاتی ہیں۔ ہم نے ڈرائیور،

کلیئرنس اور بکنگ کلرک سے بہتیرا احتجاج کیا لیکن کسی نے ایک نہ سُنی۔ ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ریاست میں امن و امان اور دیگر تمام حسن انتظام کے باوصف ٹریفک کا انتظام نہایت ناقص ہے۔ ریاست کے لوگ بے شک ایسی تنگ اور ناقص بسوں میں سفر کرنے کے عادی ہوں گے لیکن پاکستانی علاقہ سے آنے والے سیاحوں کو ان بسوں میں سفر سے سخت کوفت ہوتی ہے۔ بے شک اس سفر کو زیادہ آسان بنانے کے لئے ٹیکسیاں بھی ہیں لیکن ان میں سفر کرنا معدودے چند افراد کی استطاعت میں ہے۔ عوام کی تکلیف کا اس سے ازالہ نہیں ہو سکتا۔

بہرحال ہم چار بجے منگورا سے روانہ ہوئے۔ ۱۵ میل کے فاصلہ پر "خوزہ خیل" آتا ہے۔ یہاں سے ایک سڑک "شانگلہ پاس" پر سے ہوتی ہوئی کوہستان جاتی ہے منگورا سے کوڑہ تک باقاعدہ بس سروس جاری ہے۔ ہمارا یہ سفر بھی دریا کے ساتھ ساتھ تھا۔ خوزہ خیل سے آگے فتح پور اور پھر مدین آیا۔ مدین کا پہلا نام جوڈیاں تھا۔ لیکن پاکستان بننے کے بعد اس کا نام مدین رکھ دیا گیا۔ یہ جگہ بھی بہت سرسبز و شاداب ہے۔ بالکل پہاڑ کے دامن میں واقع ہے اور یہاں پہاڑوں کا وہ سلسلہ جن میں دریائے سوات بہتا ہے اور جن میں سوات کی وسیع وادی واقع ہے بہت تنگ ہو جاتا ہے۔ بالکل درمیان میں دریا ہے اور ارد گرد بلند پہاڑ۔ مدین میں اچھا خاصہ بازار ہے جہاں ضروریات کی تقریباً تمام چیزیں مل جاتی ہیں۔ انڈہ، مرغی، گوشت، دودھ بکثرت ملتا ہے۔ رہائش کیلئے درمیانہ درجہ کے ہوٹل بھی ہیں۔

مدین سے باہر نکلتے ہی بحرین جانے کے لئے دریائے سوات کو ایک پختہ پُل کے ذریعہ عبور کرنا پڑتا ہے۔ یہاں وادی بالکل ختم ہو جاتی ہے اور سڑک دریا کے کنارے پر پہاڑ کے ساتھ ساتھ ہو کر جاتی ہے۔ سات بجے ہم بحرین پہنچے۔ منگورا میں بحرین کی بہت تعریف سُنی تھی یہاں پہنچکر واقعی اس جگہ کو قابلِ تعریف پایا۔ یہ چھوٹا سا گاؤں دو دریاؤں کے سنگھم میں واقع ہے۔ دریا کا پانی جگہ جگہ آبشاریں بنا کر گرتا ہے۔ دونوں طرف بلند پہاڑ ہیں۔ شمالی جانب دو بلند سلسلہ ہائے کوہ کے درمیان دُور سے برفانی پہاڑ سر نکالے دکھائی دیتے ہیں۔ اس جگہ کی بلندی قریباً پانچ ہزار فٹ ہے لیکن سارا دن ٹھنڈی ہوا چلتی رہتی ہے۔ ہوا میں یہ خنکی غالباً پانی کی کثرت یا برفانی پہاڑوں کی طرف سے ہواؤں کی آمد ہے۔ یہاں کا پانی بہت ہاضم ہے عام طور پر دریا کا پانی ہی پیا جاتا ہے۔ یہاں رہائش کیلئے کوئی باقاعدہ ہوٹل نہیں۔ ہاں مقامی لوگوں کے مکان جو سڑک کے کنارے پر واقع ہیں کرایہ پر مل جاتے ہیں۔ کھانے کا انتظام خود کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ ہم نے بھی ایک مقامی دوست محمد زرین صاحب کا مکان کرایہ پر لیا اور کھانے کا انتظام خود کیا۔ سالن ہم خود پکاتے تھے اور گندم کی روٹی بازار سے منگوا لی جاتی تھی۔ مالک مکان محمد زرین صاحب ہمارے ساتھ بہت اکرام سے پیش آئے اور ہماری ہر ممکن خاطر و مدارات کی۔ تقسیم ہند سے قبل بحرین کا نام پرانیاں تھا۔ ۲۱ جون کو بحرین آرام کیا۔ ۲۲ جون کی صبح ساڑھے سات بجے ہمارا قافلہ "کالام" کے لئے پیدل روانہ ہوا۔ تمام سامان تین مزدوروں پر لادا گیا۔ کالام بحرین سے

۲۴ میل ہے۔ بحرین سے کالام عام بسیں نہیں جاتیں۔ سڑک بھی بہت تنگ اور کچی ہے جس پر صرف جیپ کار یا ویگن جا سکتی ہے۔ دن میں صرف ایک ویگن آٹھ بجے ڈاک لے کر کالام جاتی ہے اور وہی دو بجے ڈاک لیکر کالام سے واپس بحرین آجاتی ہے۔ ہمارا پروگرام بحرین سے ۱۲ میل کے فاصلہ پر نانکیال پڑاؤ کرنے کا تھا۔ اسلئے خاکسار کھانے وغیرہ کے ضروری انتظامات کے لئے بذریعہ ویگن نانکیال پہنچ گیا۔ اس ویگن میں زیادہ سے زیادہ پندرہ مسافروں کی گنجائش ہو سکتی ہے لیکن اس وقت تیس مسافر سوار تھے۔ فرنٹ سیٹ پر خاکسار کے ساتھ ریاست کی پولیس کے ملازم صوبیدار عبدالحی صاحب بھی تھے۔ مسافر جب بھی تکلیف کا اظہار کرتے تو ڈرائیور جناب پیر محمد صاحب یہ کہہ دیتے کہ میں نے تو آپ کو کہا تھا کہ سوار نہ ہوں۔ خود ہی اس تنگی میں سفر کرنا منظور کیا ہے۔ دراصل دونوں طرف مجبوری ہے۔ پبلک بھی مجبور ہے کیونکہ صرف ایک ویگن ہے۔ اگر اس میں بھی جگہ نہ ملے تو سارا دن خراب ہوں گے۔ ڈرائیور بھی مجبور ہے کیونکہ مسافر خود اس تکلیف کو برداشت کرنے پر مصر ہوتے ہیں۔

بہرحال ہمارے قافلے کے تمام افراد دو بجے تک نانکیال پہنچ گئے۔ یہاں نہ رہائش کا کوئی معقول انتظام ہے اور نہ ہی کھانے کا۔ صرف دریا کے کنارے پُل کے پاس چائے کی دو دوکانیں ہیں۔ ہم نے ایک دوکان جس کا نام "دنس ہوٹل" ہے، میں قیام کیا۔ گندم کی روٹی ہمیں صرف ایک وقت بدقت دستیاب ہو سکی۔ اس کے بعد بحرین پہنچنے تک سارے سفر میں گندم کی روٹی ملنے میں ہمیں سخت دشواری پیش آئی۔ اور اکثر مکئی کی روٹی کھانی پڑی۔ دریا کے کنارے ہم نے جمعہ کی نماز پڑھی۔ محترم مولانا ابوالعطاء صاحب نے نماز جمعہ پڑھائی اور مختصر سا خطبہ بھی دیا۔ دنس ہوٹل کے سامنے کوہ مانکیال کی برفانی چوٹیاں عجیب نظارہ پیش کر رہی تھیں۔

۲۳ جون کی صبح ۵½ بجے ہم سب کالام کی طرف پیدل روانہ ہوئے۔ بحرین سے کالام تک سارا راستہ ہی نہایت سرسبز و شاداب اور پُرلطف تھا۔ ہماری پارٹی کے کچھ افراد تیز گام تھے اسلئے وہ آگے نکل گئے تھے۔ خاکسار، محترم مولانا ابوالعطاء صاحب، محترم مولوی غلام باری صاحب سیف، امین اللہ خان صاحب سالک اور عبدالرشید صاحب نے مانکیال سے چھ میل کے فاصلہ پر لائیکوٹ مقام پر مکرم جناب مرزا عبدالقادر صاحب کے مکان میں قریباً ایک گھنٹہ آرام کیا۔ آپ باوجود اجنبیت کے بڑے تپاک اور اکرام سے پیش آئے اور چائے اور انڈوں سے ہماری مہمانی کی۔ ایک گھنٹہ آرام کے بعد ہم آگے روانہ ہوئے۔ لائیکوٹ سے آگے پہاڑی سلسلہ ذرا کشادہ ہو جاتا ہے اور سرسبزی و شادابی بھی زیادہ ہو جاتی ہے اور قدرتی مناظر زیادہ دلفریب ہو جاتے ہیں۔ جگہ جگہ سیب اور اخروٹ کے باغات ہیں۔ پانی کے چشمے پھوٹ رہے ہیں۔ سرسبز میدان ہیں۔ جی یہی چاہتا ہے کہ کم از کم تمام موسم گرما ایسے مرغزاروں میں ہی گزارا جائے۔ دریا کو عبور کرنے کے لئے جگہ جگہ لکڑی کے عارضی پُل بنائے گئے ہیں۔ لائیکوٹ سے تین میل کے فاصلہ پر پشمال آتا ہے۔

اور وہاں سے تین میل پر کالام ہے۔ بارہ بجے ہماری پارٹی کالام پہنچی۔

کالام

کالام ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ جو دو دریاؤں کے سنگھم میں واقع ہے۔ اس کے عین سامنے مغرب میں بلند پہاڑوں میں گھری ہوئی ایک پُرفضا وادی ہے۔ یہاں ایک اونچے ٹیلے پر تحصیل، تھانہ اور ریسٹ ہاؤس واقع ہے۔ ریسٹ ہاؤس میں رہائش کا انتظام تو عمدہ ہے۔ لیکن کھانے کا انتظام خود کرنا پڑتا ہے۔ کالام گاؤں میں چار کی چند ایک دوکانیں ہیں جہاں رات گزارنے کیلئے چارپائی مل جاتی ہے۔ یہاں بھی ہمیں کھانے کی دقت رہی۔

۲۳ رجون کا بقیہ دن اور ۲۴ رجون کی دوپہر تک ہم کالام میں رہے۔ واپسی سے کچھ عرصہ قبل ہماری پارٹی "کالام" کی شرقی جانب دریا کے گھنے جنگل میں سیر کے لیے چلی گئی۔ وہاں تھوڑا وقت ٹھہرنے کے بعد مولانا ابوالعطاء صاحب نے دعا کروائی۔ اس کے بعد ہم کھانا کھا کر واپس بحرین روانہ ہوئے۔ راستہ میں لائیسکوٹ پولیس پوسٹ کے پاس ہماری ویگن چند منٹوں کے لئے رُکی وہاں نہ معلوم لوگوں کو کس طرح معلوم ہو گیا کہ ہمارے پاس دوائیاں بھی ہیں۔ چنانچہ کئی مریض دوائیاں لینے کے لئے جمع ہو گئے۔ اس لئے چند منٹ میں کئی مریضوں میں ادویہ تقسیم کی گئیں۔

۵ بجے بحرین پہنچے۔ رات بحرین گزاری اور ۲۵ رجون کی صبح ۶½ بجے بذریعہ بس منگورا روانہ ہوئے۔ منگورا ۹½ بجے پہنچ کر پھر نشاط ہوٹل میں قیام کیا۔ شام کے چار بجے بادشاہ صاحب کی ملاقات کی جس کا ذکر میں پہلے کر آیا ہوں۔ رات نشاط ہوٹل میں گزاری۔ ۲۶ رجون کی صبح ۷½ بجے ہم واپس مردان روانہ ہوئے۔ اس بس میں بیٹھنے کے لئے گو الگ الگ دو دو سیٹوں کا انتظام تھا لیکن دو سیٹوں کے درمیان پھنسا کر دو فربہ سواریوں کو گھسیڑا گیا۔ گویا اس طرح چار سواریوں کی بجائے چھ سواریاں بٹھائی گئیں بہرحال ہم نے پھول کے ساتھ کانٹے سمجھ کر اس تکلیف کو بھی برداشت کیا اور بارہ بجے بخیریت مردان پہنچ گئے۔

ریاست کا عام نظم و نسق

ریاست میں ہماری سیاحت ایک طرح طوفانی سیاحت تھی کسی جگہ بھی ہم نے اتنا قیام نہیں کیا جس سے داخلی نظم و نسق کا ٹھوس بنیادوں پر اندازہ لگا سکے۔ لیکن جس حد تک بھی ہم معلوم کر سکے ہیں اور ریاست کی رعایا کی زبانی معلوم ہوا ہے اور خود حالات نے گواہی دی ہے وہ یہی ہے کہ ریاست کا عام نظم و نسق پاکستان کے عام نظم و نسق سے کسی طرح کم نہیں بلکہ بعض پہلوؤں میں کسی قدر اچھا ہی ہے ریاست میں آمد و رفت کو آسان بنانے کے لئے دُور دُور تک سڑکیں بنائی گئی ہیں۔ اور ریاست کو کئی تحصیلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جہاں حاکم رہتے ہیں۔ ان کے ماتحت کئی تھانے ہیں۔ ہر تحصیل اور تھانہ میں خواہ وہ ریاست کے کسی گوشہ میں واقع ہے باقاعدہ ٹیلیفون سروس کام کر رہی ہے جس کے ماتحت حکام حکامِ بالا سے ہر وقت رابطہ قائم رکھتے ہیں۔ اور ان دُور دراز مقامات سے اگر کسی نے بیرونی علاقہ سے گفتگو کرنی ہو تو اسی ٹیلیفون کے ذریعہ کی جا سکتی ہے۔ تار گھر صرف دار الخلافہ میں ہے لیکن جس جگہ ٹیلیفون ہے وہاں سے بھی تار دی جا سکتی ہے۔ وہ اس طرح کہ ٹیلیفون اپریٹر تار کی عبارت مرکزی تار گھر میں لکھ کر وا دیتا ہے وہاں سے تار آگے بھیج دی جاتی ہے۔ اہالیانِ سوات جو سرکشی میں مشہور تھے اب با امن شہری زندگی بسر کرتے ہیں عام مقدمات کی سماعت ہر حلقہ کا مقامی قاضی کرتا ہے جن پر سیدو شریف میں ایک قاضی القضاۃ مقرر ہے۔ ان قاضیوں اور قاضی القضاۃ کیلئے کوئی باقاعدہ دفتر نہیں مسجد میں ہی سب کچھ کیا جاتا ہے سیدو شریف

August 1956 **AL-FURQAN** Regd. L. No. 5708

رسالہ الفرقان

کا

سیرت خیرالبشر نمبر

رسالہ 'الفرقان' سرور کونین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ سیرت' آپ کی مطہر زندگی' آپ کی بے مثال تعلیم اور آپ کے زندہ اور کامل نمونہ پر مشتمل خاص نمبر بنام ''سیرت خیر البشر نمبر'' شروع اکتوبر میں شائع کر رہا ہے -

اس نمبر کی کثرت اشاعت میں آپ بھی حصہ لیکر ممنون فرمائیں - یہ نمبر سو صفحات اور عمدہ سرورق کے ساتھ طبع ہوگا - ٹھوس اور بہترین مقالات پر مشتمل ہوگا -

جملہ اہل قلم حضرات سے اس کار خیر میں شرکت کے لئے مخلصانہ دعوت ہے مضامین اور نظمیں یکم ستمبر تک پہنچ جانی چاہئیں -

خادم

ایڈیٹر الفرقان

ربوہ - (پاکستان)